جلد 25 شمارہ 10 ماہ اکتوبر 2023ء ربیع الاول / ربیع الثانی 1445ھ

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا

اللہ

محبت

صداقت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا تعارف اور اغراض و مقاصد

- سلسلہ عالیہ توحیدیہ ایک روحانی تحریک ہے جس کا مقصد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول، کثرت ذکر مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب و عرفان اور اس کی رضا و لقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا ہے۔
- حضور ﷺ کے اصحاب کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج ہے۔
- موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت مختصر اور سہل العمل اوراد واذکار کی تلقین۔
- غصہ اور نفرت، حسد و بغض، تجسّس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا عالمگیر محبّت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا ہے۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا۔ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا ہے۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبّت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے ان کے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے۔

ماہنامہ فلاحِ آدمیّت گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیاد
خواجہ عبدالحکیم انصاری رح
بانی سلسلہ

محمد صدیق ڈار رح
بانی مجلّہ فلاح آدمیت

نگران و سرپرست اعلیٰ: جناب محمد یعقوب توحیدی
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
0344-9000042

مجلس ادارت

مدیر: احمد رضا خان 0321-6400942

معاون مدیر: شہزاد محمود بخاری 0301-7430525

نائب مدیر: سید رحمت اللہ شاہ 0333-4552212

شفیق احمد، وحید احمد، پیر خان
حافظ محمد یٰسین، عبدالقیوم ہاشمی
خالد محمود بخاری
ماجد محمود توحیدی

ترسیل: فہد محمود ، محمد ریاض

شیخ سلسلہ و مدیر سے رابطہ
مرکز تعمیر ملت (ڈاکخانہ سیکنڈری بورڈ) وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
info@tauheediyah.com :ای میل Ph: 055-3411030
Website www.tauheediyah.com

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت، جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

قیمت شمارہ -/30 روپے ✿✿✿ سالانہ فنڈ -/300 روپے

اس شمارے میں

دل کی بات

سلسلہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماع کی آمد آمد ہے جس میں شمولیت کے لئے یقیناً ہر توحیدی بھائی پُر جوش ہے۔اس اجتماع کے بہت سے روحانی، علمی اور دیگر فوائد ہیں جن سے ہر بھائی بقدر ظرف فائدہ حاصل کرتا ہے۔پرانے مشائخ سالکین کو کئی کئی سال اپنے پاس ٹھہراتے اور انکو اپنے فیض صحبت سے سلوک کی منازل طے کرواتے تھے مگر آج کل کے مصروفیت بھرے دور میں یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے۔سلسلہ توحیدیہ کی تعلیمات میں اسکا متبادل یہ پیش کیا گیا ہے کہ بتائی ہوئی تعلیمات پر اخلاص اور جوش کیساتھ عمل کرنے سے فیض کا سلسلہ گھر بیٹھے ہی جاری رہے گا۔علاوہ ازیں پیر بھائیوں کے ساتھ میل ملاقات اور پیار کی جو بہت زیادہ ہدایت کی گئی ہے اسکی حکمت بھی یہ ہے کہ روحانی طور پر مضبوط بھائی جب دیگر بھائیوں سے ملاقات کریں گے تو انکی صحبت سے مبتدیوں کو روحانی و اخلاقی طور پر فائدہ پہنچے۔ملاقات کے وقت قلب سے قلب ملا کر معانقے کی بھی یہ حکمت ہے کہ جو بھرا ہوا ہے وہ دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسی طرح شیخ سلسلہ کی صحبت کے تو کیا کہنے۔جو بھائی خلوص نیت کیساتھ شیخ سے ارادت کا تعلق رکھتے ہیں وہ انکی صحبت کے اثرات کا بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں۔مذکورہ بالا تمہید کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام فوائد ہمیں صرف سالانہ اجتماع میں شمولیت کی وجہ سے یکبارگی

حاصل ہورہے ہیں آج جب کہ انسان نفسانی و مادی تقاضوں میں ڈوب کر روحانی طور پر مردہ ہو چکا ہے۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسے اس موت کا شعور بھی نہیں رہا کیونکہ اگر روح کے مردہ ہونیکا احساس ہوگا تو تبھی بندہ اسکے احیاء کی کوشش کرے گا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سلسلہ توحیدیہ سے منسلک ہونیکی وجہ سے نہ صرف ہمیں روح کے تقاضوں کا احساس ہے بلکہ اسکی ترقی کے لئے توحیدیہ تعلیمات میں ایک مربوط نظام بھی موجود ہے اور سالانہ اجتماع اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

بطور توحیدی ہماری ذمہ داری بھی ہے اور ہمارا فائدہ بھی اس میں ہے کہ ہم مرکز کی طرف سے ملنے والی ہدایات پر صدق دل سے عمل کرتے رہیں۔ اجتماع میں شمولیت کے لئے ابھی سے تیاری شروع کردیں۔ مطالعہ کتب اور انفرادی ذکر میں مزید سرگرم ہو جائیں۔ اپنی پیش آمدہ مصروفیات کو ابھی Manage کر لیں۔ کم از کم پانچ یا زیادہ احباب کو اجتماع میں شمولیت کی سنجیدہ دعوت دیں اگر ممکن ہو تو سفری مصارف بھی خود برداشت کریں۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمارے نیک ارادوں میں برکت عطا فرمائے اور ہمارے اس اجتماع کو کامیاب فرمائے۔ آمین!

والسلام!

مدیر

فلاح آدمیت

عہد حاضر میں اعجاز قرآن کا مظہر :علامہ اقبال

(ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

وجوہِ اعجاز قرآن کے ضمن میں ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک عہد حاضر میں قرآن کے اعجاز کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوا تھا اس کے اولین مخاطب عرب کے اجڈ دیہاتی بدو اور ناخواندہ لوگ تھے جنہیں قرآن نے "اُمِّیّین " اور "قَوماًلُدّا" قرار دیا ہے لیکن اس قرآن نے ان کے اندر بجلی دوڑا دی ان کے ذہن، قلب اور روح کو متاثر کیا۔ پھر ان میں ولولہ پیدا کیا ان کے باطن کو منور کیا ان کی شخصیتوں میں انقلاب آیا اور افراد بدل گئے۔ پھر انہوں نے ایسی قوت کی حیثیت اختیار کی کہ جس نے دنیا کو ایک نیا تمدن، نئی تہذیب اور نئے قوانین دے کر ایک نئے دور کا آغاز کیا لیکن بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسا ایک شخص جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا۔ جس نے مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھ لیے جو قدیم اور جدید دونوں کا جامع تھا۔ جو جرمنی اور انگلستان میں جا کر فلسفہ پڑھتا رہا۔ اُس کو اِس قرآن نے اس طرح Possess کیا اور اس پر اس طرح اپنی چھاپ قائم کی کہ اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور اس کی تشنگئ علم کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود ان کے:

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں!

میرا ایک کتابچہ "علامہ اقبال اور ہم" ایک عرصے سے شائع ہوتا ہے یہ میری ایک تقریر ہے جو میں نے ایچی سن کالج میں 1973ء میں کی تھی اس میں، میں نے علامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں، اقبال اور قرآن کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال (1 عظمت قرآن کا نشان (2 واقف مرتبہ و مقام قرآن اور (3 داعی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علامہ اقبال کو اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں قرآن مجید کے علوم و معارف کی جو تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے اس دور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچی۔ ان سے لوگوں نے چیزیں مستعار لی ہیں اور پھر ان کو بڑے پیانے پر پھیلایا ہے ان حضرات کی یہ خدمت اپنی جگہ قابل قدر ہے لیکن فکری اعتبار سے وہ تمام چیزیں علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

مذکورہ بالا کتابچے میں میں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے آپریشن کے لیے خانقاہ ڈوگراں سے لاہور آئے ہوئے تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے ان کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معطل ہو گیا تاہم فرصت کے ان ایام میں مولانا نے علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام دوبارہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے دو تاثر بیان کیے۔ مولانا کا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب کا دوسرا تاثر یہ تھا کہ اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حدی خواں اس امت میں پیدا ہوا لیکن یہ امت ٹس سے مس

نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہوگا! جو قوم علامہ اقبال کے کلام سے حرکت میں نہیں آئی اسے کون حرکت میں لا سکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب سے بڑا داعی الی القرآن علامہ اقبال ہے۔اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا ہے میری معلومات کی حد تک (اگر چہ میری معلومات محدود ہیں) اس درجے قرآن کی عظمت کا انکشاف کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دید اور ان کا تجربہ ہے کیونکہ جس انداز سے وہ بات بیان کرتے ہیں وہ تکلف اور آورد سے ماورا انداز ہوتا ہے ملاحظہ کیجئے کہ علامہ اقبال قرآن مجید کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمت اُو لا یزال است وقدیم
نسخۂ اسرار تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندہ تاویل نے
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویا است ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

"وہ زندہ کتاب "قرآن حکیم "جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی! زندگی کے وجود میں آنے کا خزینہ،جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات ودوام حاصل کر سکتے ہیں۔

ان الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردوبدل کی گنجائش۔اوراس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں ۔(اس کتاب کے بارے میں)جوبات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

یہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہےاور ظاہر بھی،اورجیتی جاگتی بولتی بھی ہےاور ہمیشہ قائم رہنےوالی بھی!

(یہ کتاب حکیم)جب کسی باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اُس کے اندر ایک انقلاب برپاہو جاتا ہے۔اورجب کسی کےاندرکی دنیابدل جاتی ہےتواس کے لئے پوری دنیا ہی انقلاب کی زدمیں آجاتی ہے۔قرآن حکیم کےبارے میں مزید لکھتے ہیں:

صد جہانِ تازہ درآیاتِ اوست

عصرہاپیچیدہ درآناتِ اوست!

"اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اوراس کےایک ایک لمحے میں بےشمارزمانےموجود ہیں"۔(گویاہرزمانے میں یہ قرآن ایک نئی شان اورنئی آن بان کے ساتھ دنیامیں آیاہےاورآتارہےگا۔)

اب آپ علامہ اقبال کےتین اشعارملاحظہ کیجئے جوانہوں نے نبی اکرمﷺ سے مناجات کرتےہوئے کہے۔ان سے آپ کواندازہ ہوگا کہ انہیں کتنایقین تھا کہ میرے فکرکا منبع قرآن حکیم ہے ۔ چنانچہ "مثنوی اسرار و رموز" کے آخر میں "عرضِ حالِ مصنف بحضوررحمۃ اللعالمینﷺ" کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

گر دِلم آئینہ بے جوہر است

ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردہ ناموسِ فکرم چاک کن

ایں خیابان را زخارم پاک کن!

روز محشر خوار و رسوا کن مرا!

بے نصیب از بوسہ پا کن مرا!

اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے تو (اے نبی ﷺ) آپ میرے ناموس فکر کا پردہ خود چاک فرما دیں اور چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں!

میں نے اپنی امکانی حد تک قرآن حکیم کا پوری باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر غور و فکر اور سوچ بچار کیا ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا اردو اور فارسی کلام بھی پڑھا ہے اس کے بعد میں نے یہ بات ریکارڈ کرانی ضروری سمجھی ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں میں نے جو بات 1973 میں کہی تھی آج بھی میں اسی بات پر قائم ہوں کہ اس دور میں عظمت قرآن اور مرتبہ و مقام قرآن کا انکشاف جس شدت کے ساتھ اور جس مرتبہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو اور یہ کہ میرے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور داعی القرآن اقبال ہے علامہ اقبال مسلمانوں کی قرآن سے دوری پر مرثیہ کہتے ہیں

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں

ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں!

مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست

کہ از یٰسین اور آسان بمیری!

اس قرآن کے ساتھ تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تم کسی شخص کو عالم نزع میں اس کی سورہ یٰسین سنا دو تا کہ اسکی جان آسانی سے نکل جائے۔

ہمارے ہاں صوفی اور واعظ حضرات نے قرآن کو چھوڑ کر اپنی مجالس اور اپنے وعظ کے لیے کچھ اور چیزوں کو منتخب کر لیا ہے تو اس پر اقبال نے کس قدر دردناک مرثیے کہے ہیں اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے

صوفی پشمینہ پوش حال مست — از شراب نغمہ قوال مست

آتش از شعر عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآں محفلش

واعظ دستاں زن و افسانہ بند — معنی او پست و حرف او بلند

از خطیب و دیلمی گفتار او — با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

ا

اونی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ لگ جاتی ہے لیکن اس محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پر شکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے اس کا سارا سروکار بس ضعیف شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور امت مسلمہ کی نکبت

وافلاس اور ذلت وخواری کا اصل سبب قرآن سے دوری اور کتاب الٰہی سے بُعد ہی ہے چنانچہ جواب شکوہ کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ علامہ مرحوم نے فارسی میں نہایت پر شکوہ الفاظ اور حد درجہ دردانگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا۔

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چو شبنم برزمیں افتندہ
در بغل داری کتاب زندہ!

(اے مسلمان) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردش زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے) اُٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتاب زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے دوبارہ بام عروج پر پہنچ سکتی ہے)۔

میں اپنا تاثر ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ عصر حاضر میں قرآن کی عظمت جس درجہ اُن پر منکشف ہوئی تھی میں اپنی محدود معلومات کی حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک علامہ اقبال دور حاضر میں اعجاز قرآن کا ایک عظیم مظہر ہیں۔

باباجی رحمۃ اللہ علیہ کے دوست

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

سلسلہ توحیدیہ کے بانی حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ دہلی سے ہجرت کر کے کراچی تشریف لائے تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے آپ نے وہاں انڈین آرمی کے ہیڈ کوارٹر میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت بھی کی تھی۔ راقم الحروف ائیر فورس کی ملازمت کے دوران 1964ء سے 1968ء تک رسالپور میں تعینات تھا۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ قبلہ حضرتؒ کے دو دوستوں سے میری ملاقات رسالپور میں ہوئی۔ وہاں میری رہائش صدر بازار میں جگی بلڈنگ کے پاس مبارک شاہ صاحب سے لیے ہوئے کرائے کے مکان میں تھی۔ ایک دن دروازے پر دستک ہوئی تو باہر آ کر دیکھا کہ پاجامہ کرتہ میں ملبوس، سیاہ رنگ کی رامپوری ٹوپی پہنے، داڑھی مونچھ صاف ایک دھان پان سے بزرگ کھڑے ہیں۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ میرا نام عزیز احمد ہے اور میں انصاری صاحب کا دوست ہوں۔ میں لاہور گیا تو انہوں نے مجھے آپ کے نام خط دیا۔ یہ سن کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ میں نے انہیں اندر بٹھایا اور ان سے خوب گپ شپ ہوئی۔ وہ ہمارے قریب ہی ریلوے پھاٹک کے ساتھ واقع کنٹونمنٹ ڈسپنسری کے سامنے رہتے تھے اس لیے ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ انہیں حضرت رسالدار محمد حنیف خاںؒ کی مجالس میں حاضری کا شرف بھی حاصل تھا۔ اس لیے ان سے اپنے بزرگوں کی بڑی مزے مزے کی باتیں سننے کو ملتیں۔ وہ بہت ہی کم گو اور سیدھے سادے انسان تھے۔ کچھ عرصہ بعد قبلہ حضرتؒ نے ایک مجلس میں

ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

''عزیز احمد واقعی میرا دوست تھا۔ہم نے کافی وقت اکٹھے گزارا۔وہ بہت ہی پرخلوص اور بھولا بھالا انسان ہے۔ہم دہلی میں تھے تو اس نے مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں مشورہ کیا۔میں نے کہا کہ تم تو بڑے فیشن ایبل اور شاہ خرچ قسم کے انسان ہو بھلا اس تنخواہ میں بیوی بچوں کا خرچہ کس طرح پورا کرو گے۔اکیلی بیوی کا مسئلہ تو نہیں ہے شادی کے بعد دو چار بچے بھی تو ہوں گے۔اگر تمہارا بجٹ ایک کنبے کی کفالت کرسکتا ہے تو خوشی سے شادی کرلو وہ شریف آدمی اس حساب کتاب میں ایسا پڑا کہ عمر بھر شادی نہیں کی۔وہ رسالپور میں اپنی بہن کے پاس رہتا تھا۔ملازمت سے جو رقم ملی وہ اس نے اپنے بھانجوں کی تعلیم وغیرہ پر خرچ کردی وہ گزشتہ برس عمرے پر جانے سے قبل مجھے ملنے آیا تھا اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں۔ اللہ جانے وہ کہیں وہاں ہی نہ رہ گیا ہو''

قبلہ حضرتؒ کے جو دوسرے دوست رسالپور میں اتفاق سے دریافت ہوئے ان کا اسم گرامی حاجی محمد ظریف تھا اور وہ اپنے صاحبزادے محمد یونس صاحب جو اس وقت ائیر فورس میں فلائٹ لیفٹیننٹ تھے کے ساتھ مقیم تھے۔حاجی صاحب کا معمول تھا کہ آپ ہر سال ایامِ حج میں ایک محفل منعقد کر کے اپنے حج کے واقعات بیان کر کے اپنی مقدس یادیں اور سامعین کا ایمان تازہ فرمایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ یہ مجلس ہمارے بھائی ملک رمضان میاں کے گھر میں منعقد ہوئی جس میں تمام حاضرین ہمارے تو حیدی بھائی تھے۔حاجی صاحب کے بیان کے بعد جب عام گفتگو ہوئی اور باتوں کا رخ روحانیت کی طرف مڑا تو قبلہ حضرتؒ کا ذکر چھڑ گیا۔خواجہ عبدالحکیم انصاری کا نام سن کر حاجی صاحب چونک پڑے اور فرمایا کہ کیا یہ خواجہ عبدالحکیم انصاری دہلی کے رہنے والے تو نہیں ہیں جو کبھی آرمی ہیڈ کوارٹر میں ملازمت کرتے تھے؟

کیا وہ پیر بن گئے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ یہ وہی انصاری صاحب ہیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی بنیا د رکھی ہے اور ہم سب بھائی ان کے حلقہ بیعت میں شامل ہیں۔ اس پر حاجی صاحب نے بتایا کہ وہ بھی انصاری صاحب کے ساتھ ہی ملازم تھے۔ اس کے بعد سلسلہ توحیدیہ کے بانی اور سلسلہ کے بارے میں تفصیل سے بات چیت ہوتی رہی۔ پھر حاجی صاحب نے قبلہ حضرتؒ سے خط و کتابت کے لیے ان کا ایڈریس بھی لے لیا۔ حاجی صاحب اللہ کے فضل سے تہجد گزار اور زاہد و عابد قسم کے انسان تھے۔ قبلہ حضرتؒ کی ہدایت پر آپ چند ماہ ہماری ذکر کی محفلوں میں شامل ہوتے رہے پھر ہم انہیں 1966ء کے سالانہ اجتماع پر اپنے ساتھ نوشہرہ ورکاں لے گئے تاکہ آمنے سامنے حساب دوستاں ہو سکے۔

چنانچہ وہاں دونوں بزرگوں کی خوب محفل جمی اور حاجی صاحب اپنی دوستی کا حق جتا کر اصرار کرتے رہے کہ ایک ہی نظر میں میرا کام کردیں۔ قبلہ حضرتؒ نے فرمایا کہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ کچھ دیر جم کر اللہ اللہ کرو دو تین برسوں میں تمہارا کام ہو جائے گا۔ اس پر حاجی صاحب نے کہا کہ اتنا انتظار نہ کراؤ بوڑھا آدمی ہوں زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ یہ سن کر قبلہ حضرتؒ نے فرمایا ''خدا کی قسم! تم نہیں مرو گے لاؤ میں لکھ کر دے دیتا ہوں'' حاجی صاحب تصوف کی کتابوں کے حوالہ سے عرض کرتے کہ بزرگ تو نگاہوں کے خنجر کے ایک ہی وار سے کام تمام کر دیتے تھے آپ بھی میرے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ کریں۔ قبلہ حضرتؒ نے انہیں تشفی دی اور بڑے پیار سے سمجھایا کہ فقیری کا راستہ عاشق لوگوں کا ہے اور آپ میں عشق کی کمی ہے۔ میں نگاہوں کا خنجر تو مارتا ہوں لیکن آپ کے دل پر کثرت عبادت سے ریشم اور زربفت کے اتنے تھان لپٹے ہوئے ہیں کہ خنجر اثر ہی نہیں کرتا۔ آپ ماشاءاللہ پانچ وقت کے

نمازی ہیں، تہجد گزار ہیں، ہر وقت ذکر و اذکار میں مشغول رہتے ہیں تو اللہ جنت تو دے ہی دے گا۔ آپ کو کیا مصیبت پڑی ہے فقیری کے بکھیڑوں میں پڑنے کی۔ اگر چہ حاجی صاحب کے من کی مراد تو پوری نہ ہوئی لیکن اجتماع پر حاضر برادران سلسلہ حاجی صاحب اور قبلہ حضرتؒ کے مکالمہ سے بڑے محظوظ ہوئے اور حاجی صاحب کو مدتوں یاد کرتے رہے۔ قبلہ حضرتؒ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ حاجی ظریف صاحب ملازمت کے دوران ہمارے ساتھی ضرور تھے لیکن مزاج کے اختلاف کی وجہ سے ان سے ہماری دوستی اتنی گہری نہ تھی۔

ریڈیو پاکستان کی مشہور شخصیت زیڈ اے بخاری آپ کے نہایت ہی بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''ہم جب کراچی میں اکٹھے تھے تو بخاری سے خوب ملنا جلنا رہتا تھا۔ ان کے ساتھ بے تکلف مجلسیں جمتیں اور دوستانہ مزاح ہوتا۔ ایک دن میں اسے ملنے گیا تو خلافِ معمول وہ بڑے سنجیدہ اور مودب طریقے سے پیش آیا۔ میں نے کہا سالے آج تجھے کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔ جو یہ بے گانگی برت رہے ہو۔ اس نے کہا انصاری صاحب! میں معذرت خواہ ہوں آئندہ آپ مجھ سے کسی بدتمیزی یا بے تکلفی کی توقع ہرگز نہ رکھیں۔ وجہ پوچھنے پر اس نے کہا کہ پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ پیر بھی ہیں۔ اب مجھے پتہ چل گیا ہے اس لیے آپ کا احترام مجھ پر واجب ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ پیر ہوں گا تو دوسروں کا تمہارا تو نہیں ہوں۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ پھر ہم نے اس کے پاس جانا ہی بند کر دیا۔ ہم تو جاتے تھے کہ بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں لگانے کا موقع مل جاتا تھا۔ لیکن کسی ظالم نے وہاں بھی ہماری مخبری کر دی اور ہمیں دوستوں کی محفل سے محروم کر دیا۔''

گنج ہائے گرانمایہ

(طارق محمود)

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے لے کر اب تک کچھ بھائیوں کی حلقہ کیلئے خدمات اس لائق ہیں کہ اُن کا اور انکی خدمات کا تعارف دیگر اہلِ حلقہ تک اُن کی کاوشوں کے ادنیٰ سے اعتراف کے طور پر پہنچایا جائے۔صاحبِ مضمون راولپنڈی حلقہ کے طارق محمود ہیں جو خود بانی سلسلہ سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔اُنکے والدِ محترم بھی ساٹھ کی دہائی میں سلسلے سے منسلک ہوئے تھے۔بیشتر واقعات اُنکے چشم دید ہیں۔اِس سلسلہ ہائے مضامین کا عنوان مرزا غالب کے مشہور شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

مقدور ہوتو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

آج کا مضمون جناب خواجہ ولی محمد صاحب کے بارے میں ہے

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے راولپنڈی حلقہ کا تذکرہ، خواجہ ولی محمد صاحب کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط خدمات اور قربانیوں کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔اختصار کیلئے خواجہ ولی محمد کی بجائے خواجہ صاحب ہی لکھا جائے گا۔

حالاتِ زندگی:- آج سے پچاس سال پہلے پیدا ہونے والی نسل کی تاریخ پیدائش اور ستر، اسی سال پہلے والی نسل کے سال پیدائش کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ناممکن ہے۔

حالات وواقعات کی روشنی میں خواجہ صاحب کی عمر تقریباً نوے سال کے لگ بھگ بنتی ہے۔

خواجہ صاحب کشمیری النسل ہیں۔مقبوضہ کشمیر کے ایک گاؤں ''سُنبل'' میں پیدا ہوئے۔انکے والد، اپنے بھائی کی زمینوں میں کھیتی باڑی کر کے گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ تقسیم پاک وہند کے وقت مہاجرین کے قافلوں کی آمد ورفت اور گھر کے مالی حالات کو دیکھتے ہوئے خواجہ صاحب نے بھی قسمت آزمائی کا سوچا اور بغیر گھر والوں کو بتائے راولپنڈی پہنچ گئے۔ یہ شہر تب چند آبادیوں پر مشتمل تھا۔راجہ بازار واحد کاروباری مرکز ہوا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب نے مزدوری کو ذریعہ معاش بنایا کہ تعلیم تھی نہیں اور ہنر کوئی آتا نہیں تھا۔صحت اچھی تھی، چار آنے فی بوری مزدوری ملا کرتی تھی۔ہندو مہاجرین کے جانے کی وجہ سے رہائش اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔خواجہ صاحب دن بھر کی مزدوری میں سے حسبِ ضرورت اپنے کام میں لاتے اور باقی خیرات کر دیا کرتے تھے۔

بعد ازاں انہوں نے صرافہ بازار کے ایک شخص کے ہاں ملازمت اختیار کر لی جہاں انکو تیں روپیہ ماہوار اور کھانا بطور معاوضہ ملتا تھا۔ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو ایک حکمنامہ جاری ہوا جس میں ہندو مہاجرین کی متروک املاک پر قابض مقامی لوگوں کو فی الفور یہ املاک خالی کرنے یا آنیوالے مہاجرین کے حوالے کرنے کو کہا گیا تھا۔خواجہ صاحب جس شخص کے ہاں ملازمت کر رہے تھے،اس نے بھی ہندو مہاجرین کی کافی جائیداد ہتھیائی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ زمین خواجہ صاحب کے حوالے کر دی۔یوں خواجہ صاحب کو اپنی موجودہ دکان کی ملکیت حاصل ہوگئی۔

سالہا سال کی ملازمت کے بعد بھی جب خواجہ صاحب کے معاوضے میں کوئی اضافہ نہ کیا گیا تو انہوں نے سنجیدگی سے اپنا کام شروع کرنے کا سوچا۔اپنے خیر خواہوں کے

تعاون سے انہوں نے دُکان کی چھت ڈالی اور اپنے کاروبار کا آغاز کر دیا۔ عام فہم الفاظ میں یہ کاروبار سونے کے زیورات میں استعمال ہونے والی گولیوں کا تھا۔ جن کو بنانے کی ترکیب کچھ اتنی مشکل نہ تھی۔ کاروبار میں دیانتداری کے باعث یہ کام چل نکلا اور خواجہ صاحب ''گولیوں والی سرکار'' کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

پرانے زیورات کا لین دین بھی انکے کاروبار میں شامل تھا۔ ناکارہ زیورات کو پگھلا کر سونے کی ڈلی میں تبدیل کر کے مشینوں کی مدد سے ایک باریک پٹی میں تبدیل کیا جاتا اور اس کے بعد گولیاں بنانے کا عمل۔ فروخت کیلئے آنیوالے سونے کو جانچ پڑتال کیلئے خواجہ صاحب ایک پتھر پر جسے ''کسوٹی'' کہتے ہیں، گھسا کر اسکی رنگت سے سونے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ (دیکھنے والے کو یہ عمل یونہی نظر آتا تھا)۔

ایسی کوئی ''کسوٹی'' اگر انسانوں کو پرکھنے کیلئے خواجہ صاحب کے پاس ہوتی تو یہ بہت سے لوگوں کے مکروفریب اور شر سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

خواجہ صاحب نے اپنی زندگی کے اولین دور سے ہی ضرورتمندوں کی حتی الامکان مدد کرنا اپنی ترجیحات میں شامل رکھا۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور تب تک سکون سے نہیں بیٹھتے تھے جب تک اسکے دُکھ کا مداوا نہ ہو جائے۔ خواجہ صاحب کی اس نرم دلی اور سادہ مزاجی کا لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا، حتیٰ کہ سلسلے کے کچھ مفاد پرست عناصر بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہے۔ کئی ایک نے کاروباری شراکت کے نام پر بھاری رقمیں بٹوریں۔ کاروبار چل بھی نکلے، منافع انکے حصے میں آیا اور خسارہ خواجہ صاحب کے کھاتے میں۔ لین دین کے معاملے میں تحریری معاہدے کے متعلق واضح حدیث پر عمل نہ کر کے خواجہ صاحب نے بارہا نقصان اٹھایا اور پریشانی الگ مُول لی۔

کنواں اور مسجد:- خواجہ صاحب کی موجودہ دکان کے عین سامنے ایک قطعہ اراضی بطور مسجد استعمال ہوتا تھا جس کے صحن میں ایک کنواں بھی تھا۔ یہ کنواں کسی ہندو عورت نے رفاہِ عامہ کیلئے بنوایا تھا اور وہی اسکی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ موجودہ دور میں ان کنوؤں کی افادیت اور ضرورت کا ادراک بھی مشکل ہے۔ نہ صرف پینے بلکہ گھریلو ضروریات کیلئے پانی بھی یہیں سے بھرا جاتا تھا۔ تقسیم کے وقت اِس ہندو عورت کے چلے جانے سے یہ کنواں بے توجہی کا شکار ہو گیا۔

خواجہ صاحب نے آس پاس کے کاروباری حضرات سے اپیل کی کہ اس کنویں کی صفائی کر کے اسے قابلِ استعمال بنائے رکھنے کیلئے مشترکہ فنڈ قائم کرلیا جائے، تو انہوں نے تعاون کیلئے شرط رکھ دی کہ اس صورت میں پانی بھرنے کا استحقاق صرف اہل محلّہ کا ہو گا۔ خواجہ صاحب نے اس شرط کو منظور نہ کیا اور اپنے ذاتی وسائل سے کنویں کا انتظام سنبھال لیا۔ بعد میں مزید سہولت کیلئے بور کروا کر ایک نلکا (ہینڈ پمپ) بھی لگا دیا۔ یہ نلکا خواجہ صاحب کی ایک اہم دلچسپی بن گیا۔ رفتہ رفتہ خواجہ صاحب نے اس نلکے کی مرمت کیلئے اوزار خریدے اور معمول کی خرابیوں کو درست کرنا بھی سیکھ لیا۔ بلکہ اگر آس پاس کسی نلکے کی خرابی کا پتہ چلتا تو اوزاروں والا تھیلا اٹھا کر وہاں پہنچ جاتے اور بلا معاوضہ مسئلہ حل کر دیتے۔

بہت شروع کے دور میں خواجہ صاحب سے ملنے والوں نے انکی نلکے سے وابستہ کارگزاری لازماً سنی ہوگی۔ میرا چونکہ خواجہ صاحب کے ہاں آنا جانا مترؔ کی دہائی سے ہے، اس لئے یہ قصہ بہت بار سنا۔ اب البتہ کچھ یاد نہیں۔ اس دور میں نلکے کی داستان شروع ہوتے دیکھ کر یا تو میں اِدھر اُدھر کھسک جاتا تھا یا خواجہ صاحب کو اس موضوع سے دور لے جاتا۔ نلکے اور اس کیلئے ’’بور‘‘ کی داستان بہت بور کیا کرتی تھی۔

یہ مضمون لکھنے سے پہلے میں نے پہلی مرتبہ خواجہ صاحب سے یہ قصہ چھیڑنے کی فرمائش کی لیکن افسوس!

خواجہ صاحب خاصے دھیمے انداز میں سنا رہے تھے جس کو سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ یادداشت بھی اس عمر میں کہاں ساتھ دیتی ہے۔ میں ایک صفحے کا مواد بھی جمع نہ کر سکا۔

اہل وعیال:- ساٹھ کے عشرے میں خواجہ صاحب رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ راولپنڈی میں ان کا کوئی عزیز یا سرپرست تو تھا نہیں جو اس معاملے میں سلسلہ جنبانی کرتا۔ ایک جامع مسجد کے امام سے انکی نیازمندی تھی۔ امام صاحب ایک پشاور سے آئی ہوئی فیملی کو جانتے تھے۔ اُن کے ایما پر خواجہ صاحب کا رشتہ اِس پٹھان خاندان میں طے پا گیا۔ سُسر کے انتقال کے بعد اس خاندان کی کفالت بھی بخوشی اپنے ذمہ لئے رکھی۔

خواجہ صاحب کے ہاں تین بیٹیاں اوپر تلے پیدا ہوئیں۔ کسی بھائی نے قبلہ انصاری صاحب سے خواجہ صاحب کیلئے اولادِ نرینہ کی دعا کیلئے درخواست کی تو انہوں نے مزاحاً تیسری بٹی کا نام اُخریٰ بیگم رکھنے کی تجویز بھی دی تھی۔ تیسری بٹی کے بعد خواجہ صاحب کے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ قدرتی طور پر پہلے بیٹے کو لاڈ پیار زیادہ ہی ملنا تھا۔ فرمائشیں بھی اسکی کم ہی ٹالی جاتی ہوں گی۔ جمعہ کے روز موٹر سائیکل ریس نوجوانوں کا مشغلہ تب بھی تھا۔ خواجہ صاحب کے اس فرزندِ ارجمند نے بھی ایک ہیوی بائیک لے رکھی تھی اس شوقِ فضول کی خاطر۔ مری روڈ سے براستہ فیض آباد۔ زیرو پوائنٹ تک اِن کی جولانگاہ ہوا کرتی تھی۔ سنا ہے پیچھے بیٹھے اپنے دوست کو اِس عزیز نے یہ کہہ کر اُتار دیا کہ تو اپنے ماں باپ کا اکلوتا ہے۔

زیرو پوائنٹ کے پاس موٹر سائیکل بے قابو ہو کر کسی پتھر سے ٹکرایا اور کئی فٹ دور تک لڑھکتا، گھسٹتا گیا، شدید زخمی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا جہاں ایک رات

موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر پسماندگان کو ایک عظیم صدمے سے دوچار کر گیا۔

خواجہ صاحب کے اکلوتے داماد غلام محمد کی ناگہانی وفات اور وہ بھی عنوانِ شباب میں، ایک اور سخت آزمائش تھی، غلام محمد نہایت سعادت مند اور ہنس مکھ نوجوان تھے۔ حلقہ ذکر کے انتظامات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ دونوں صدمے بلا شبہ بہت تکلیف دہ تھے لیکن ہم نے دیکھا کہ خواجہ صاحب نے تسلیم و رضا کے سبق کو فراموش نہیں کیا۔

حلقہ سے تعارف:- ساٹھ کے عشرے میں حلقہ ذکر اسی علاقے میں ہوتا تھا جہاں خواجہ صاحب کی دکان اور وہ مسجد واقع ہیں۔ کنویں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ، مسجد کے معاملات بھی خواجہ صاحب کی دلچسپی میں شامل ہو گئے تھے۔ صدیق ڈار صاحب اس وقت خادمِ حلقہ ہوا کرتے تھے۔ ان کو اس مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے استفسار کیا کہ اس مسجد کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟ (شاید کسی خادم کے نہ ہونے کے سبب ان کے ذہن میں یہ بات آئی ہو)۔ انہیں بتایا گیا کہ ایک شریف النفس کشمیری نوجوان یہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے۔ صدیق ڈار صاحب نے اس نوجوان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو انہیں بتایا گیا کہ مسجد کے سامنے والی دکان میں وہ کشمیری نوجوان موجود ہوتا ہے۔

یوں خواجہ صاحب کی ملاقات محترم صدیق ڈار صاحب سے ہو گئی۔ ڈار صاحب نے خواجہ صاحب کو حلقہ میں آنے کی دعوت دی اور یہاں سے ان کا حلقہ سے وابستگی کا طویل سفر شروع ہوا۔ جو اب تک جاری ہے۔ صدیق ڈار صاحب کا تبادلہ پشاور ہو گیا تو انہوں نے حلقہ ذکر کا انتظام بھی خواجہ صاحب کے سپرد کر دیا جو اب تک انہی کے ہاں چلا آ رہا ہے۔

راقم الحروف کا سلسلے سے تعارف 1968 کے سالانہ کنونشن کے موقع پر ہوا۔ لاہور میں پرنس ہوٹل کے اس اجتماع کے وقت میری عمر دس سال تھی۔ اس دور میں خواتین اور

بچوں کی شمولیت سالانہ کنونشن میں ممنوع نہ تھی ۔ مجھے اپنا رات بھر قوالی کی محفل میں بیٹھنا، متعدد بار ابامیاں کی طرف سے نذرانہ دے کر سٹیج تک بھیجا جانا، خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحب اورعبدالستار صاحب سے مصافحہ کرنا، دورانِ اجتماع بانی سلسلہ کوہم دونوں بھائیوں کا سہارا دیکر خواتین والے خیمے تک لے جانا قوالی کے بعد الوداعی مصافحے کیلئے والد صاحب کا ہاتھ تھامے قبلہ انصاری صاحب کے پاس جانا اوران کا میرے سر پر انگلیاں پھیرتے ہوئے فرمانا کہ ''میاں!تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ یہ تو تماشا ہے تماشا''، ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے مندرجہ بالا بیان کا مقصد یہ ہے کہ بعد کے سالوں خصوصاً ستر کی دہائی میں راولپنڈی منتقل ہوجانے کے بعد، اب تک خواجہ ولی محمد صاحب اور حلقہ راولپنڈی کے معاملات کا میں بذات خود عینی شاہد ہوں ۔

حلقہ ذکر کی میزبانی:- یہ خواجہ ولی محمد صاحب کا ہی حوصلہ ہے کہ حلقہ ذکر کی میزبانی کے بارِگراں کو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے اٹھائے ہوئے ہیں۔خصوصاً ستر کی دہائی کا دور جب اہلِ حلقہ کی تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ تھی ۔ان دنوں خواجہ صاحب اپنے موجودہ ذاتی مکان کے بالمقابل ایک کرائے کے مکان میں رہا کرتے تھے ۔بیٹھک بھر جانے پر صحن میں بھی چٹائیاں بچھانا پڑ جاتی تھیں۔

حلقہ ذکر کے بعد کھانے کی روایت بھی شروع سے ہی خواجہ صاحب کے ہاں چلی آرہی ہے، اتنے لوگوں کیلئے ہر جمعے خوردونوش کا اہتمام بھی آسان کام نہیں ۔اس زمانے میں خواجہ صاحب کی بیٹھک گویا ایک مستقل مہمان خانہ ہوا کرتی تھی ۔اہلِ حلقہ کے علاوہ اس بیٹھک میں کسی اور کے آنے کا امکان تھا نہیں لہٰذا صوفے، میز وغیرہ کی بجائے دریاں، چادریں اور تکیئے دستیاب ہوتے تھے ۔کراچی سے پشاور تک، کسی حلقے سے وابستہ شخص کو

دفتری یا ذاتی کام کیلئے راولپنڈی آنا ہوتا تو وہ بلا جھجک خواجہ صاحب کے گھر کا رخ کرتا، ہوٹل کم کم ہوا کرتے تھے اور اہل حلقہ کی اکثریت معاشی طور پر متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی ۔ خواجہ صاحب کے ہاں قیام و طعام کی سہولت بلا معاوضہ میسر تھی ۔ بہت دفعہ تو آنیوالے کئی کئی روز بھی قیام کرتے تھے ۔

حلقہ ذکر کے علاوہ اِن بن بلائے مہمانوں کے قیام و طعام کی ذمہ داری خواجہ صاحب اور انکے اہلِ خانہ کا ایک ہمہ وقتی فریضہ بنی رہتی تھی ۔اہلِ حلقہ کی خاطر داریوں میں الجھے رہنے سے یقیناً کئی خانگی معاملات بے توجہی کا شکار ہوئے ۔ کچھ اہم گھریلو ذمہ داریاں بھی ادھوری رہ گئیں جس کی بڑی وجہ خواجہ صاحب کے سوشل سرکل کا اہلِ حلقہ تک محدود ہونا ہی گنی جائے گی ۔اہل حلقہ کے آرام و آسائش کو خواجہ صاحب نے اپنی پہلی ترجیح بنائے رکھا اور اہل حلقہ نے اپنے ذکر وفکر اور قیام وطعام کو۔

یقیناً اپنے معاشی معاملات کو انکا مطلوبہ وقت دے کر خواجہ صاحب اپنا اور اپنے اہلِ خانہ کا معیارِ زندگی بہت بہتر کر سکتے تھے ۔اہل حلقہ نے انکے مسائل اور معاملات کو جانتے ہوئے بھی انکے حل کیلئے کوئی قابلِ ذکر کوشش نہ کی ۔مندرجہ بالا تلخ حقائق کے نتیجے میں کچھ عرصہ خواجہ صاحب کو اہلِ خانہ کی طرف سے لنگر کے انتظامات میں عدمِ تعاون بھی برداشت کرنا پڑا ۔لیکن انہوں نے ایک ہوٹل والے سے معاملہ طے کر لیا او راہلِ حلقہ کے معاملات شکم پر آنچ نہیں آنے دی ۔کافی عرصہ تک پورچ میں سیڑھیوں کے نیچے بھی لنگر خانہ قائم رہا۔

سالہا سال اقبال بھائی کے بنائے ہوئے لُطف ولذت سے بھرپور لنگر کی بھی ایک داستان ہے ۔اقبال صاحب کے بھائی شمشاد، خواجہ صاحب کی وجہ سے حلقے میں آئے ۔ شریف الدین اور رضا شاہ صاحب انکی دکان پر جاتے تو اقبال بھائی سے بھی ملاقات ہوتی ۔

انکو رضا شاہ نے حلقے میں آنے کی دعوت دی تو انہوں نے کہا میں نماز، روزہ تو کرتا نہیں حلقہ ذکر میں کیا کروں گا؟ انہوں نے کہاں تم کھانے کیلئے آجایا کرو۔ اقبال بھائی بتاتے ہیں کہ کھانا کھانے آنا شروع کیا تو کھانا بنانے کی ڈیوٹی لگ گئی۔ اور پھر یہیں دل لگ گیا۔

غالباً 1974ء میں قاضی غیور احمد انصاری صاحب اسلام آباد میں تعینات ہوئے۔ یہ قبلہ انصاری صاحب کے پہلے مرید تھے۔ ایک بات عجیب اس دور کی مشاہدے میں آئی کہ ایک وقت میں ایک مجاز راولپنڈی میں ہوا کرتے تھے۔ ان سے پہلے اسلام آباد والے محمد مرتضےٰ تھے۔ وہ بسلسلہ ملازمت لیبیا گئے تو قاضی غیور صاحب لاہور سے تبدیل ہو کر یہاں آ گئے۔ جب وہ واپس لاہور گئے تو عطا اللہ شاہ بخاری (ملتان والے) چکلالہ میں تعینات ہو گئے۔ ستر کی دھائی کے آخری سالوں میں قبلہ انصاری صاحب کی وفات کے بعد

آں قدح، بشکست و آں ساقی نماند

(وہ جام ٹوٹ گیا اور وہ ساقی نہ رہا)

تاوقتیکہ نوے کی دہائی میں قبلہ صدیق ڈار صاحب کی سربراہی میں اہلِ حلقہ کو گوجرانوالہ میں "مرکز تعمیرِ ملت" میسر آیا۔

قاضی غیور احمد انصاری ایک بذلہ سنج، باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، حلقہ ذکر کے بعد گپ شپ کا ایک طویل دور چلا کرتا تھا جو رات گئے تک جاری رہتا۔

اس دور میں افراتفری بہت کم تھی۔ معاشرتی مسائل تو تھے لیکن طرزِ زندگی سادہ ہونے کی وجہ سے لوگ اتنے اُلجھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ اہلِ حلقہ کی دوستیاں بھی آپس میں ہی تھیں۔ باہمی اخوت و محبت کے جذبات کو سلسلے کی تعلیم نے مہمیز کیا۔

قاضی غیور انصاری صاحب کی محفل میں آنے اور بیٹھنے والوں کو قلبی سوز و گداز سے

آشنائی تو ابتدائی ملاقاتوں میں ہی ہو جاتی تھی۔ محفل میں گپ شپ اور لطائف بھی چلتے رہتے ،لذتِ کام و دہن کا اہتمام بھی لیکن اصل چیز ان محفلوں کے روحانی اثرات تھے جو حاضرین کو اُٹھنے نہیں دیتے تھے۔ ہفتہ وار حلقہ ذکر کے علاوہ بھی برادرانِ حلقہ اکٹھ مل بیٹھنے کا پروگرام بنا ہی لیتے تھے اور اس مقصد کیلئے ٹھکانہ خواجہ صاحب کی بیٹھک ہی ہوتی تھی۔

اکثر اوقات اِن محفلوں میں حاضرین حسبِ توفیق ایک ایک، دو دو روپے نکالتے، کل رقم جو بیس پچیس روپے بنتی تھی، وہ خواجہ صاحب کو پیش کی جاتی کہ وہ اسکو دُگنا کر دیں۔ خواجہ صاحب بخوشی مان جاتے اور جمع شدہ رقم سے مٹھائی وغیرہ منگوائی جاتی۔ قاضی غیور صاحب کا منظورِ نظر ہونے کی وجہ سے محفل میں مجھے بھی خصوصی حیثیت حاصل ہوتی تھی ۔مٹھائی میں ان دنوں مجھے رس گلے زیادہ پسند تھے۔ حلقہ میں مٹھائی لے کر آنیوالوں کیلئے خصوصی ہدایت ہوا کرتی تھی کہ رس گلے ہر صورت مٹھائی میں شامل ہونے چاہئیں (اب البتہ برفی زیادہ مرغوب ہوگئی ہے)۔

عیدالاضحیٰ کے دن کا بھی ایک دلچسپ معمول ہوا کرتا تھا ،نمازِ عید پڑھ کر اکثر برادرانِ حلقہ خواجہ صاحب کے گھر کا رُخ کرتے تھے۔ بکرے ذبح کئے جاتے، گوشت بنا کے بیٹھک میں ہی ایک چولہے پر پریشر ککر بھر کر چڑھا دیا جاتا، گوشت گل جاتا تو دیکھتے دیکھتے نذرِ شکم ہو جاتا اور دوسرا دور شروع ہو جاتا۔ خورونوش کے ساتھ اِن محافل کی چاشنی وہ اخلاص اور محبت تھی جو اس سلسلے کا طرۂ امتیاز تھی۔

خواجہ صاحب قربانی کیلئے خوبصورت اور تنومند بکرے یا دُنبے خریدا کرتے تھے۔ شنید ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ صاحب نے ایک قد آور مینڈھا خریدا۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ یہ انکو پُل صراط پار کروا دے گا یا نہیں، اس پر سوار ہو گئے ۔مینڈھا منہ زور قسم کا تھا اُس نے

خواجہ صاحب کو زمین پر پٹخ دیا۔

خواجہ صاحب کی مختصر سی دکان جو بھابڑہ بازار اور صرافہ بازار کے سنگم پر واقع ہے، شام کے وقت اہل حلقہ کی آماجگاہ ہوا کرتی تھی۔ حیرت ہوتی ہے بمشکل بیس، پچیس مربع فٹ کی جگہ میں آٹھ دس بھائی کیسے سما جاتے تھے۔ خواجہ صاحب سونے کا لین دین اور گولیوں کی رگڑائی بھی جاری رکھتے اور آنے والوں کی خاطر تواضع سے بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔

دکان کے باہر ایک تھڑا سا بھی '2'x6 کا تھا جس پر دو سٹول پڑے ہوتے تھے۔ دو دو افراد تو ان پر بھی سکڑ سمٹ کے بیٹھ جاتے تھے۔ ایک روز قبلہ انصاری صاحب کے داماد جو آفاقی صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے، ایک سٹول پر اور انکے سامنے دوسرے سٹول پر میں اور عبدالسلام (مرحوم) بیٹھے ہوئے تھے۔ دورانِ گفتگو! اچانک آفاقی صاحب نے عبدالسلام سے پوچھا کہ اسلام میاں! تم کونسے سکیل میں ہو؟ عبدالسلام اس وقت سٹینو گرافر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گیارھویں سکیل میں ہوں۔ آفاقی صاحب کا سگریٹ پینے کا ایک خاص انداز تھا۔ دوران گفتگو آنکھیں بند کر کے ایک لمبا کش سگریٹ کا لیا کرتے تھے اور پھر اپنی بات جاری رکھتے۔ عبدالسلام کی بات سن کر انہوں نے آنکھیں موندیں، ایک لمبا کش لیا اور کہنے لگے "سترھویں سکیل تک پہنچ ہی جاؤ گے"۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا "طارق میاں! تم کونسے سکیل میں ہو؟" میں ان دنوں کچھ اپنی لاپرواہی، کچھ گھریلو مسائل اور کسی حد تک اہلِ حلقہ کی عاقبت نا اندیشانہ توجہ کی وجہ سے ایف ایس سی میں فیل ہو کر ٹیلیفون ٹیکنیشن کی ملازمت شروع کر چکا تھا۔ جب میں نے آفاقی صاحب کو اپنا سکیل بتایا (جو کہ سکیل نمبر 8 تھا) تو انہوں نے پھر ایک طویل کش سگریٹ کا اپنے مخصوص انداز میں لیا اور جیسے مستقبل میں جھانکتے ہوئے گویا ہوئے "تم تو سترہ، اٹھارہ بلکہ انیسویں تک پہنچ جاؤ گے"

ان دنوں سترھویں سکیل والے بھی خال خال ہی ہوتے تھے۔ آفاقی صاحب سیکریٹریٹ میں ملازمت کرتے تھے جہاں ڈپٹی سیکریٹری کا عہدہ (انیسواں سکیل) ملازمت کی معراج سمجھا جاتا تھا۔

معروضی حالات کو دیکھتے ہوئے میرے بارے میں انکی پیش گوئی نے عبدالسلام کے بارے میں سترھویں سکیل والی بشارت کو بھی مشکوک کردیا۔ہم دونوں نے اُنکی اس گفتگو کو بڑھاپے کے اثرات سمجھ کر زیادہ اہمیت نہ دی۔عبدالسلام محکمانہ ترقی پاتے پاتے سترھویں سکیل میں پہنچ گئے بلکہ Move Over ملنے پر اٹھارویں سکیل میں آ گئے۔بعد ازاں سکیل Revise ہونے پر واپس سترھویں میں آنا پڑا اور اسی سے ریٹائر ہوئے۔

میں نے حکیم مختار قطب چغتائی (المعروف حکیم پتھر) کے ترغیب دلانے پر ایف ایس سی کے چار سال بعد تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ایم ایس سی (ریاضی) کے بعد پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے سنٹر فار نیوکلیئر سٹڈیز میں ایم ایس (نیوکلیئر انجینئرنگ) کی ڈگری لی۔سترھویں سکیل سے ملازمت شروع کی،اٹھارھویں اور پھر انیسویں تک پہنچ گیا۔ یوں آفاقی صاحب کی اس روز خواجہ صاحب کی دکان کے تھڑے پر کہی ہوئی بات عین اسی طرح پوری ہوئی۔بیسویں سکیل کی پروموشن کو جب مقررہ مدت سے چار سال اوپر ہو گئے تو یہی خدشہ ہوا کہ درویش کی بات پوری ہو کے رہے گی اور انیسویں سے آگے جانا نصیب نہ ہوگا یہ الگ بات کہ ڈاکٹر مسعود اقبال (جو کہ میری طرح پیدائشی طور پر سلسلہ توحیدیہ سے وابستہ ہیں) کی مخلصانہ کوشش کے طفیل بیسویں سکیل میں حائل رکاوٹ دور ہوگئی۔

ایک دلچسپ واقعہ: لگے ہاتھوں خواجہ صاحب کی سادہ مزاجی سے متعلق بھی ایک واقعہ سن لیجئے، جو آج بھی یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی زندگی کا آخری کنونشن (1976ء) جیلانی گارڈنز (شیخوپورہ) میں منعقد ہوا جو بدقسمتی سے پہلی رات ہی شدید طوفانی بارش کے سبب معطل کرنا پڑا۔ اس کنونشن کے بعد جیلانی خاندان کے ایک چشم و چراغ کو خواجہ صاحب کی دکان پر گاہے بگاہے دیکھا جانے لگا۔ پھر خبر ملی کہ خواجہ صاحب کو فرید جیلانی نے اپنی شادی میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ خواجہ صاحب نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا: میں ایف ایس سی کے امتحان سے فارغ ہو چکا تھا۔ سپانسرڈ تفریح کا موقع کیوں ضائع کرتا۔

ہم جیلانی صاحب کے شہر والے گھر پہنچے جہاں سے شادی کی تقریب کے مقام تک گاڑیاں مہمانوں کو لے جا رہی تھیں۔ ہمیں کچھ دیر انتظار کا کہا گیا۔ خاصی دیر گزر گئی، گاڑیاں آتی تھیں اور حسبِ مراتب حاضرین کو بٹھا کر بھیج دیا جاتا۔ گھنٹہ بھر گزر گیا تو میں نے خواجہ صاحب کے کان بھرنے شروع کیے کہ یہاں صرف اہلِ زر کی آؤ بھگت ہو رہی ہے آپ ٹھہرے ایک زرگر، بہتر یہی ہے کہ چپکے سے نکل چلیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں نے خواجہ صاحب کو قائل کر لیا کہ اگلے پندرہ منٹ میں ہمیں نہ لیجایا گیا تو ہم واپس چلے جائیں گے پندرہ منٹ بعد خواجہ صاحب کو بادلِ ناخواستہ اٹھنا پڑا۔ ہم نے باہر آ کے ایک ہوٹل سے کھانا کھایا۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ یہاں تک تو آئے ہوئے ہیں، کیوں نہ قبلہ انصاری صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھ کے واپس جایا جائے۔ مجھے لاہور کی مفت سیر پر کیا اعتراض ہونا تھا۔ چنانچہ G-92 ماڈل ٹاؤن لاہور پہنچے۔ آستانہ کے ''گارڈ روم'' کی تفتیش کے مراحل سے گزرنے سے بہتر سمجھا کہ پچھلی طرف خالی پلاٹ میں کھڑے ہو کر دیوار سے قبر مبارک کو دیکھتے ہوئے فاتحہ پڑھ لی جائے۔ فاتحہ کے بعد خواجہ صاحب اُلٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ چند قدم بعد ایک غڑاپ کی آواز آئی اور خواجہ صاحب ایک کیچڑ بھری کچی نالی میں

کھڑے پائے گئے۔ٹخنوں سے اوپر تک کیچڑ میں لت پت،انکواس حالت میں دیکھ کرمیرے لئے ہنسی روکنا ناممکن تھا۔کچھ دور آکرایک کھوکھے سے پانی لیکر خواجہ صاحب نے پاؤں اور کپڑے دھوئے اور ہم نے گھر کی راہ لی۔

خدمتِ خلق: سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم میں ریاضت اور سلوک کا حاصل خدمتِ خلق کو قرار دیا گیا ہے۔تعمیرِ ملت میں ''سلوک اور اس کے عملی طریقے'' کے عنوان کے تحت، خدمتِ خلق کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں۔کم سے کم صورت کسی کو راستہ بتانا۔کسی کا بوجھ اُٹھادینا۔بھوکے اور ننگے کو روٹی کپڑا دینا،بیماروں کی تیمارداری اور علاج۔ان سے بڑھ کر کسی کو اس قابل بنا دینا کہ وہ معاشی لحاظ سے اپنی زندگی آرام سے گزار سکے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کسی کو اللہ کا راستہ بتانا۔

خواجہ صاحب نے خدمتِ خلق کی یہ سب صورتیں کسی نہ کسی انداز میں پوری کیں جنکی بہت مختصر تفصیل بطور نمونہ پیشِ خدمت ہے۔

1972ء میں راقم الحروف کے گھرانے نے ایک گھر کا سٹرکچر جیسے تیسے مکمل کیا۔محدود مالی وسائل کے سبب دروازے نہ لگائے جا سکے تو ہم نے چقیں لگا کر اس گھر میں رہائش اختیار کر لی تاکہ کرایہ کی مد میں دی جانے والی رقم بچائی جا سکے۔گھر کی تعمیر پر اس وقت بھی قریبی عزیز و اقارب اور دوست احباب مبارکباد کیلئے آیا کرتے تھے۔خواجہ صاحب کا آنا بھی اسی سلسلے میں ہوا۔سردیوں کے دن تھے علاقہ بھی کھلا تھا۔خواجہ صاحب نے بھانپ لیا کہ جمع پونجی ختم ہو چکی ہے۔ہمیں تو اپنا گھر مل جانے کی خوشی میں سردی کا اتنا احساس نہیں تھا۔لیکن خواجہ صاحب گھر دیکھنے کے بعد کچھ بے چین سے ہو گئے کہ اتنی سردی میں دروازوں کے بغیر کیونکر گزرتی ہوگی۔مجھے تاکید کی کہ فوری طور پر دروازوں کی لاگت کا تخمینہ لگوا کر کل دکان پر آؤ۔

اگلے روز مطلوبہ رقم میرے حوالے کی جو بعد میں واپس بھی نہیں لی۔ مالی تعاون کی اہمیت اپنی جگہ لیکن خواجہ صاحب کے اس احساس کی حرارت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

حلقہ راولپنڈی کے بھائی غلام مرتضٰے صاحب کا ارادہ حج کا اپنے کچھ عزیز و اقارب کے ساتھ بنا۔ 1994ء میں حج کے اخراجات پچاس ہزار روپے فی کس تھے۔ مرتضٰے صاحب کے پاس دس ہزار روپے کم پڑ رہے تھے۔اس دور میں یہ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔خواجہ صاحب کی فیاضانہ طبیعت سے تو ہر شخص واقف تھا۔اہل حلقہ کیلئے ان کی خصوصی شفقت کو دیکھتے ہوئے یہ اُن کی دکان پر پہنچے اور انہیں اپنے حج پر جانے کے ارادے کا بتایا۔ خواجہ صاحب نے مرتضٰے صاحب سے پوچھا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔مرتضٰے صاحب نے جب بتایا کہ دس ہزار روپے کم پڑ رہے ہیں تو خواجہ صاحب نے سیف کھولا، رقم گن کر انکے حوالے کر دی۔(کسی میرے جیسے مسائل فقہ سے واقف، صاحبِ فہم سے یہ رقم مانگی گئی ہوتی تو انہیں ادھار لے کر حج پر جانے سے متعلق کسی مفتی سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتا اور حج پر جانے سے باز رہنے کے حق میں کوئی نہ کوئی روایت ڈھونڈ نکالتا)۔

اتفاق سے اتنی ہی رقم حج کے اخراجات سے بچ گئی اور واپس آ کر مرتضٰے صاحب جب یہ رقم لوٹانے خواجہ صاحب کی دکان پر گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کیا کہ اسکی واپسی کے بارے میں تو کوئی عہدو پیان ہوا ہی نہیں تھا۔آج تیس سال بعد بھی کسی کو دس ہزار روپے دے کر معاف کر دینے کا حوصلہ شاید ہی کسی کا ہو۔غلام مرتضٰے صاحب نے البتہ اصرار کر کے یہ رقم خواجہ صاحب کو واپس کر دی۔

خواجہ صاحب کو ایک بڑے میاں بے یار و مددگار نظر آئے بیمار بھی تھے، خواجہ صاحب ترس کھا کر انکو اپنے گھر لے آئے۔ان کا علاج معالجہ کروایا۔بیگم سے مصلحتاً

جھوٹ بول دیا کہ بڑے میاں میرے دور کے رشتہ دار ہیں۔ اتفاقاً مل گئے ہیں۔ اِن کا بھی میری طرح اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ یہ ہمارے ساتھ ہی اس گھر میں رہیں گے۔ انکی خدمت بجالانا ہمارے لئے سعادت مندی ہو گی۔ یوں بڑے میاں اطمینان سے خواجہ صاحب کے ہاں قیام پذیر ہو گئے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے خود کو واقعی اس گھر کا سرپرست اور مختارِکل سمجھنا شروع کر دیا۔ مکینوں پر باقاعدہ حکم چلانے لگے۔ انکی گھر میں مداخلت اتنی بڑھ گئی کہ اہلِ خانہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ آخر کار خواجہ صاحب نے بڑے میاں کو بیک بنی و دو گوش گھر سے باہر کا رستہ دکھایا اور اس بلائے خود پروردہ سے نجات حاصل کی۔

خواجہ صاحب کی شادی کے بعد جب انکے سُسر کا انتقال ہو گیا تو پسماندگان کی کفالت بھی خوشدلی سے کرتے رہے۔ ان کا برادرِ نسبتی کم سِن تھا۔ اُسے زمانے کے حوادث سے محفوظ رکھنے کیلئے اپنی دکان پر ساتھ بیٹھا لیا۔ اور کام سکھایا اور اس پر اپنی اولاد کی طرح اعتبار کیا، بعد ازاں اس نے اپنا کاروبار شروع کر لیا اور معاشی طور پر آسودہ زندگی گزاری۔

خواجہ صاحب کی خوشدامن بھی اُس پیرِ تسمہ پا کی طرح زیادہ عرصہ انہی کے ہاں رہیں اپنی بدمزاجی کے سبب اہلِ خانہ کے سکون کو درہم برہم کیے رکھتیں۔ اصولی طور پر وہ خواجہ صاحب کی ذمہ داری ہرگز نہ تھیں۔ لیکن خواجہ صاحب نے خندہ پیشانی سے اس اذیت کو بھی برداشت کیے رکھا۔

ایک نوجوان ارشد نامی جو اپنی معمولی ملازمت سے مطمئن نہ تھے۔ خواجہ صاحب سے ملے تو ان دنوں اسلام آباد کے سیکٹر G-9 میں خواجہ صاحب کا گھر زیرِ تعمیر تھا۔ خواجہ صاحب نے اس نوجوان کو ملازمت سے بہتر مشاہرے پر اس گھر کی تعمیر کے معاملات کی نگرانی سپرد کر دی۔ اکثر معاملات میں خواجہ صاحب کی دور اندیشی اور فہم و فراست کی کمی نے

انکو خاصا نقصان بھی پہنچایا۔ اِس گھر کی وجہ سے وہ اپنے معیارِ زندگی کو بہت بہتر بنا سکتے تھے۔ ارشد کے معاملے میں بھی گھر کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد کے منظر نامے پر کوئی پلاننگ نہیں کی گئی تھی۔ ملازمت اسکی وہ پہلے ہی چھڑوا چکے تھے۔ بہر حال اب اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے خواجہ صاحب نے پنڈی گھیپ کے اس نوجوان کو بھی اپنے ساتھ دکان پر بیٹھالیا ارشد کی حیثیت بھی گھر کے فرد یا شراکت دار جیسی نظر آتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نوجوان نے کاروبار کی باریکیاں سمجھ کر، خواجہ صاحب کی اجازت سے اسی بازار میں اپنا کاروبار شروع کرلیا اور دیکھتے دیکھتے اسلام آباد کے مشہور کاروباری مرکز ایف سیون میں ایک نمایاں جیولر بن گئے۔ ان دنوں موصوف کاروبار اپنے بیٹے کے سپُرد کر کے تعمیرات کے بزنس سے منسلک ارب پتی شخصیت ہیں۔ یہ بات البتہ خوش آئند ہے کہ اس تمام معاشی ترقی (جس میں انکی اپنی جدوجہد کا بہت عمل دخل ہے) کیلئے وہ خواجہ صاحب کے تعاون کو فراموش نہیں کرتے اور خواجہ صاحب سے اسی ادب واحترام سے ملتے ہیں۔ ملک ارشد کو میں نے ملک التجار کا نام دے رکھا ہے۔

اس گھر کی تعمیر سے وابستہ ایک دلچسپ قصہ بھی سن لیجئے۔

خواجہ صاحب کا G.9 والا گھر مکمل ہوا تو ایک حلقہ ذکر بشمول محفلِ سماع کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ پشاور کے اہلِ حلقہ بھی شامل ہوئے۔ وہ صابری برادران اور عزیز میاں قوال کے عروج کا دور تھا۔ معلوم نہیں کس بِرتے پر میں نے تجویز پیش کردی کہ محفلِ سماع کیلئے عزیز میاں قوال کو بلایا جائے۔ (عزیز میاں ان دنوں راولپنڈی منتقل ہو چکے تھے اس لئے آمدورفت کے اضافی اخراجات کی بچت تھی) اہلِ حلقہ نے میری بات پر کوئی دھیان نہ دیا کہ عزیز میاں کے پروگرام کا معاوضہ کون دے گا۔

میں نے حکیم مختار صاحب سے اپنی اس معصوم سی خواہش کا اظہار کیا تو کہنے لگے اس کے پاس جاؤ تو میرا نام لے دینا۔ میں اور عبدالسلام ،عزیز میاں کے گھر گئے ۔ بات چیت شروع ہوئی تو ہم نے حکیم صاحب کا حوالہ دیا۔سن کے پھڑک اٹھا کہ کہاں ہیں آجکل حکیم صاحب؟ پھر اس نے بتایا کہ دس پندرہ سال سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ پروگرام کی بات ہوئی تو کہنے لگا آپ ایسے شخص کے حوالے سے آئے ہیں کہ مجھے کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جو آپ کا جی چاہے دے دیجئے۔ ہمارے اصرار پر اس نے رعائیت کرتے ہوئے دس ہزار کی بجائے چھ ہزار مانگے۔(یہ رقم آجکل کے حساب سے چھ لاکھ بنتی ہے)۔خیر ہم واپس آئے اور حکیم صاحب کو عزیز میاں سے ہونے والی بات چیت سے آگاہ کر دیا۔فرمانے لگے،میرے ٹکڑوں پہ پلا ہوا،مجھ سے معاوضہ لے گا؟اب آپ صرف اسکے کھانے کا بندوبست کرلیں وہ بغیر معاوضے کے آئے گا۔اسکے کھانے کیلئے حکیم صاحب نے چند سو روپے بھی خود دیئے۔بالآخر پروگرام ہوا اور عزیز میاں قوال نے اپنے فن کے خوب جوہر دکھائے مگر توحیدی رنگ نہ بن سکا۔میں نے بہر حال اپنی فرمائش پر کچھ قوالیاں اس سے پڑھوالیں۔

خدمت خلق کا اعلیٰ ترین درجہ کسی کو اللہ کے راستے پر لگا دینا ہے۔اس معاملے میں بھی خواجہ صاحب کا توشہ دان خالی نہیں۔کئی لوگ انکی وجہ سے سلسلے میں شامل ہوئے اور ذکر، فکر میں لگ گئے۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو حلقے کی تعلیم کی بجائے خواجہ صاحب کے دسترخوان کی کشش کھینچ لاتی تھی۔لیکن یہ بات جاننے کے باوجود کبھی انکو اشارۃً بھی احساس نہیں ہونے دیا۔

موجودہ منظر نامہ: خواجہ ولی محمد صاحب اس وقت حلقۂ توحیدیہ کے طویل العمر

بھائیوں میں میرے علم کے مطابق سرفہرست ہیں۔بڑھاپے کے مسائل تو خیر اپنی جگہ لیکن اس عمر میں بھی خواجہ صاحب کسی پر بوجھ بنے بغیر اپنے روزمرہ معمولات بخیر وخوبی انجام دے لیتے ہیں۔حلقہ ذکر میں بنفسِ نفیس شامل ہوتے ہیں۔

انکے تین بیٹوں میں سے چھوٹے دو کا رجحان تو حلقہ کی طرف نہیں ہے نہ کبھی انہوں نے حلقہ ذکر میں علامتی طور پر ہی شرکت کی۔ایک عمران ولی ہے جو حلقہ ذکر اور لنگر کے معاملات کو بدستور نبھائے جارہا ہے۔کبھی کبھی میں از راہِ مذاق اسے کہا کرتا ہوں کہ خواجہ صاحب کے بعد شاید تم اہلِ حلقہ کوٹکا سا جواب دے دو کہ:

کچھ اپنے دل پر بھی زخم کھاؤ میرے لہو کی بہار کب تک؟

لیکن امکان غالب ہے کہ بھائیوں پر مشتمل اس حلقہ ذکر کی روایت کو جوانکی زندگی کا ایک اہم معمول بن چکی ہے۔ختم کرنے پر اسکی اپنی طبیعت بھی آمادہ نہ ہوگی۔

خواجہ صاحب کے ملنے والوں میں سے شاید ہی کسی نے ان سے یہ شعر اور مصرع نہ سنے ہوں۔

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں ملکر گل وگلزار ہوتا ہے

اور

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

خواجہ صاحب کی زندگی بلاشبہ اس شعر اور مصرع کی عملی تفسیر ہے۔

ذکراللہ،شکر،صبر

(مولانا تقی عثمانی)

اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ایسی لذیذ اورآسان عبادت ہے کہ اسے انسان معمولی سی توجہ سے ہر وقت انجام دے سکتا ہے، اوراس کے فضائل اورفوائد بے شمار ہیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جابجا اپنا ذکرکرنے کی تاکیدفرمائی ہے۔مثلاً ارشاد ہے:

ترجمہ: اے ایمان والو!اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکرکرو۔

ظاہر ہے کہ ذکرکرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں،وہ بندوں کے ذکر سے بے نیاز ہے۔لیکن اس میں بندوں کا فائدہ ہے کہ ذکر کی کثرت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے اورانسان کی روح کوغذا ملتی ہے،جس سے اس میں بالیدگی اورقوت پیدا ہوتی ہے۔اس روحانی قوت کے نتیجے میں انسان کے لئے نفس اورشیطان کا مقابلہ آسان ہوجاتا ہےاورگناہوں سے بچنے میں بھی سہولت ہوتی ہےاورہر ذکر کے ساتھ نامہ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے رسولِ اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اورقیامت کے دن سب سے بلند رُتبہ عبادت کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر۔

ایک صحابی نے ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! نیکیوں کی

قسمیں تو بہت ہیں اور میں ان سب کو انجام دینے کی استطاعت نہیں رکھتا، لہٰذا مجھے ایسی چیز بتا دیجیے جسے میں گرہ سے باندھ لوں اور زیادہ باتیں نہ بتایئے گا، کیوں کہ میں بھول جاؤں گا۔ آں حضرت ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہا کرے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

جس گھر میں اللہ کا ذکر کیا جائے اور جس گھر میں اللہ کا ذکر نہ کیا جائے، ان کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔ (یعنی ذکر والا گھر زندہ ہے اور بغیر ذکر کا گھر مُردہ)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ کسی مجلس سے اس حالت میں اٹھ جائیں کہ اس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا ہو تو وہ مردار گدھے پر سے اٹھے، اور مجلس ان کے لیے (قیامت کے دن) حسرت کا باعث بنے گی (یعنی یہ حسرت ہوگی کہ اتنا وقت ہم نے بے کار ضائع کر دیا)۔

اسی لیے حدیث میں آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مجلس کے آخر میں یہ کلمات پڑھ لینے چاہئیں:

سبحانک اللھم و بحمدک لا الہ انت استغفرک و اتوب الیک

اس سے مجلس کی کوتاہیوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

ذکر اللہ کی ان عظیم فضیلتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو اتنا آسان بنا دیا ہے کہ اس کے لیے کوئی شرط عائد نہیں فرمائی۔ اگر وضو کے ساتھ قبلہ رُخ ہو کر یکسوئی سے ذکر کر سکے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اس کا موقع نہ ملے تو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کام میں لگے ہوئے ہر حال میں یہ عبادت انجام دی جا سکتی ہے، اس کیلئے وضو بھی شرط نہیں ہے، بلکہ حالتِ جنابت اور حالتِ حیض میں بھی ذکر جائز ہے۔ صرف برہنگی کی حالت میں یا نجاست کے مقامات پر مثلاً

بیت الخلاء میں زبان سے ذکر نہیں کرنا چاہیے۔اس وقت بھی دل دل میں ذکر کرنا جائز ہے، لہٰذا اس عظیم عبادت کا ثواب انسان ہر وقت بغیر کسی خاص محنت و مشقت کے حاصل کر سکتا ہے ۔اور مناسب یہ ہے کہ دن رات میں کچھ وقت تو ایسا مقرر کرلیا جائے جس میں با قاعدہ باوضو اور قبلہ رُخ ہو کر یکسوئی سے ذکر کیا جائے اور باقی اوقات میں چلتے پھرتے، کاموں کے درمیان، لیٹے بیٹھے جتنے ذکر کی توفیق ہو جائے نعمت ہی نعمت ہے۔

خاص خاص اذکار کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ بہت مفید ہے:

۱۔ ''فضائلِ ذکر'' شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ذکریاؒ۔

۲۔ ''ذکر اللہ'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ۔

۳۔ ''معمولات یومیہ'' سیدی وسندی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی۔

چند مختصر اذکار مندرجہ ذیل ہیں، چلتے پھرتے ان کو وردِ زبان رکھنے کی عادت ڈال لی جائے۔

۱۔حدیث میں آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب چار کلمے ہیں:

سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله و الله اکبر

۲۔حدیث میں ہے کہ دو کلمے رحمٰن کو بہت محبوب ہیں، وہ زبان پر ہلکے ہیں، مگر میزانِ عمل میں بہت وزنی ہیں:

سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم

۳۔حدیث میں ہے کہ **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ** کثرت سے پڑھا کرو، کیوں کہ یہ کلمات جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

۴۔ترجمہ: حدیث میں ہے کہ جو شخص صبح کے وقت یہ کلمات پڑھے تو اس کو اولادِ اسماعیلؑ میں

سے دس غلاموں کو آزاد کرانے کا ثواب ملتا ہے، دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، دس گناہ معاف ہوتے ہیں، دس درجے بلند ہوجاتے ہیں اور شام تک وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔اور یہی کلمات شام کو کہے تو صبح تک یہی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ؎

شکر

اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتیں ہر آن انسان پر مبذول رہتی ہیں۔یہ نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ:اور اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ان کو ٹھیک ٹھیک شمار نہ کرسکو گے۔

شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر دوسری نعمتوں کو چھوڑ دیا جائے تو صرف زندگی کی نعمت اتنی بے حساب ہے کہ ہر سانس میں دو نعمتیں پنہاں ہیں، سانس کا اندر جانا ایک نعمت اور باہر آنا دوسری نعمت ہے۔کیوں کہ اگر سانس اندر جائے اور باہر نہ آئے تو مصیبت ہے،اور باہر آئے اندر نہ جائے تو دوسری مصیبت ہے،لہٰذا ہر سانس پر انسان کو دو نعمتیں ملتی ہیں،اور ہر نعمت شکر کا تقاضا کرتی ہے،لہٰذا اگر ہر سانس پر آدمی ایک بار شکر ادا کرے تب بھی صرف سانس کی نعمت کا شکر ادا نہیں ہوسکتا،دوسری بے شمار نعمتوں کا تو کیسے شکر ادا ہوسکتا ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ٹھیک ٹھیک شکر ادا کرنا تو انسان کے بس سے باہر ہے۔ لیکن کثرت سے شکر ادا کرتے رہنا ایک انتہائی محبوب عمل ہے،جس پر ثواب بھی بے حساب ملتا ہے۔نعمتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ:پس تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا،اور تم میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ترجمہ: اور ہم شکر کرنے والوں کو اچھا صلہ دیں گے۔

نیز ارشاد ہے: ترجمہ: اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھیں میرا عذاب سخت ہے۔

اللہ تعالیٰ کو شکر گزار بندہ بہت محبوب ہے اور ناشکرا شخص نہایت ناپسند ہے۔ کیوں کہ ناشکری انتہائی تنگ نظری کی علامت ہے۔ ناشکرے شخص کو اگر کوئی ذرا سی تکلیف پہنچ جائے تو وہ اسی کو لے بیٹھتا ہے۔ اسے وہ بے شمار نعمتیں نظر نہیں آتیں جو عین اس تکلیف کے عالم میں بھی اس پر برس رہی ہوتی ہیں، اور وہ ذرا سی تکلیف کو پہاڑ بنا کر اسی کا رونا روتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف شکر گزار بندے کا حال یہ ہے کہ تکلیف کے عالم میں بھی اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر رہتی ہے۔ وہ ان نعمتوں پر شکر بھی ادا کرتا ہے اور ساتھ ساتھ تکلیف کے دور ہونے کی بھی دعا کرتا ہے۔

فرض کیجیے کہ کسی شخص کو کوئی بیماری لاحق ہو گئی، اگر وہ ناشکرا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتوں کو بھلا کر اپنے آپ کو سب سے زیادہ ستم رسیدہ اور مظلوم سمجھے گا اور ناشکری کے کلمات زبان سے نکال دے گا۔ لیکن اگر وہ شکر گزار بندہ ہے تو بیماری سے مغموم اور پریشان ہونے کے باوجود وہ یہ سوچے گا کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے بیشتر اوقات میں جو صحت عطا فرمائی، وہ کتنی بڑی نعمت تھی، اور اس بیماری میں بھی تیمارداروں، معالجوں اور دواؤں کی صورت میں تسلی کے جو اسباب میسر ہیں وہ کتنی بڑی نعمت ہیں۔ جو لوگ اس سے زیادہ بیمار ہیں، ان کا تصور کر کے شکر ادا کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی بیماری سے محفوظ رکھا۔ وہ بیماری دور ہونے کی دعا ضرور کرے گا، لیکن شکوے کے لہجے میں نہیں بلکہ اپنی کمزوری اور عاجزی کے لہجے میں، وہ تکلیف سے پریشان بھی ہو گا تو اس پریشانی میں ناشکری اور

گلے شکوے کا شائبہ نہیں ہوگا۔

انسان پر شیطان کا سب سے پہلا حملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ناشکری میں مبتلا کر دیتا ہے۔قرآن کریم میں ہے کہ جب شیطان کو قیامت تک جینے کی مہلت مل گئی تو اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں آپ کے بندوں کو بہکاؤں گا، اور ہر سمت سے ان پر حملہ آور رہوں گا۔پھر اپنے ان حملوں کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ

ترجمہ:اور آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو شکر کی عبادت سے محروم کر کے انھیں ناشکرا بنادے۔اس کے برخلاف جو بندہ شکر گزار بننے کا تہیہ کر لے،اس پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

غرض اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بڑی عظیم عبادت ہے اور یہ عظیم عبادت چند لمحوں میں ادا ہو جاتی ہے۔حدیث میں ہے کہ

ترجمہ: جو شخص کھانا کھا کر شکر ادا کرے وہ ثواب میں اس روزہ دار کے برابر ہے جس نے کھانے سے صبر کیا ہو۔

لہٰذا شب و روز کی زندگی میں جو کوئی چھوٹی بڑی نعمت یا راحت میسر آئے اس پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔گھر میں داخل ہو کر گھر والوں کو عافیت سے دیکھا تو شکر ادا کرے،اچھا کھانا سامنے آیا تو شکر ادا کرے،ہوا کا جھونکا اچھا معلوم ہو تو شکر ادا کرے،بچہ کھیلتا ہوا اچھا لگا تو شکر ادا کرے،غرض ہر وہ بات جس سے خوشی یا آرام حاصل ہو اس پر شکر ادا کرنے اور کرتے رہنے کی عادت ڈالنی چاہیے،اگر زبان سے نہیں تو دل ہی دل میں شکر ادا کر لینا چاہیے۔

نیز بزرگوں نے یہ بھی تلقین فرمائی ہے کہ رات کو بستر پر پہنچ کر سونے سے پہلے کچھ دیر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تصور کیا کرے اور ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرے۔ مثلاً تصور کرے کہ الحمد اللہ میری اور اہل و عیال کی صحت ٹھیک ہے، الحمد اللہ سر چھپانے کو گھر میسر ہے، الحمد اللہ بستر آرام دہ ہے، الحمد اللہ جان و مال محفوظ ہیں۔ غرض جتنی راحتیں میسر ہیں ان سب کا ایک ایک کر کے تصور کرے اور اس پر شکر ادا کر کے سوئے۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حقیقی شکر یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق نبھائے، لیکن اگر زبان اور دل سے کثرت کے ساتھ شکر ادا کرنے کی عادت ڈال لے تو یہ بھی ایک عظیم عبادت ہے، اور امید ہے کہ ان شاء اللہ اس کی برکت سے دوسرے اعمال کی بھی اصلاح ہوگی۔

یوں تو شکر ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ متعین نہیں ہے۔ ہر انسان اپنی زبان میں بھی شکر کر سکتا ہے، لیکن آں حضرت ﷺ نے ادائے شکر کے لئے ایسے جامع الفاظ بھی تلقین فرمائے ہیں

۱۔ترجمہ: یا اللہ! آپ کا شکر ہے، ایسا شکر جو آپ کے دائمی وجود کے ساتھ دائمی ہو، آپ کا شکر ہے، ایسا شکر جو آپ کے ہمیشہ رہنے کے ساتھ ہمیشہ رہے، اور آپ کا شکر ہے، ایسا شکر جس کی آپ کی مشیت کے سوا کوئی انتہا نہیں، اور آپ کا شکر ہے، ایسا شکر جس کا کہنے والا آپ کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، اور آپ کا شکر ہے آنکھ کی ہر جھپک پر اور سینے کے ہر تنفس پر۔

۲۔ترجمہ: اے اللہ! آپ کی حمد کرتا ہوں آپ کی مخلوقات کی گنتی کے برابر، اور آپ کے کلمات کی سیاہی کے برابر، اور آپ کے عرش کے وزن کے برابر، اور آپ کی خوشنودی کے مطابق۔

حضرت عبداللہ بن غنامؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے شکر کے یہ کلمات تلقین فرمائے۔

۳۔ اے اللہ! مجھے یا آپ کی مخلوق کے کسی اور فرد کو جو بھی نعمت ملے، وہ تنہا آپ کی

طرف سے ہے۔آپ کا کوئی شریک نہیں ۔پس تعریف آپ ہی کی ہےاور شکر آپ ہی کا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص یہ کلمات صبح کے وقت کہےاس نے اپنے اس دن کا شکرادا کیا،اور جو شخص یہ کلمات شام کے وقت کہےاس نے اپنی اس رات کاشکرادا کر دیا۔[1]

صبر

اللہ تعالٰی نے اس کائنات میں تین قسم کے عالم پیدا کیے ہیں:ایک وہ عالم جس میں خوشی ہی خوشی اور آرام ہی آرام ہے،غم اور تکلیف کا کوئی شائبہ نہیں، یہ جنت کا عالم ہے۔ دوسرا وہ جس میں تکلیف ہی تکلیف اور غم ہی غم ہے،اس میں خوشی اور آرام کا کوئی شائبہ نہیں، یہ دوزخ کا عالم ہے۔اورایک عالم وہ ہے جس میں خوشی بھی ہےاور غم بھی ،راحت بھی ہےاور تکلیف بھی ،اور یہ عالم دنیا ہے۔لہٰذااس دنیا میں آج تک نہ کوئی ایساانسان ہوا ہے، نہ ہوسکتا ہے جسے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو۔انسان خواہ کتنا ہی دولت مند ہو، کتنا ہی با اختیار ہو، کتنا ہی نیک اور متقی ہو،اسے اس دنیا میں خوشی کے ساتھ غم سے،اور آرام کے ساتھ تکلیف سے ضرور سابقہ پیش آئے گا، بڑے بڑے پیغمبر بھی تکلیفوں اور پریشانیوں سے گزرے ہیں۔

لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی کوئی تکلیف یا صدمہ نہ پہنچےتو وہ اس دنیا کی حقیقت ہی سے جاہل ہے،اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوسکتی، کم اور زیادہ کا فرق ضرور ہوسکتا ہے،لیکن تکلیف اور صدموں سے بالکلیہ نجات اس دنیا میں ممکن نہیں:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

لہٰذا اس دنیوی زندگی میں ہر شخص کو کسی نہ کسی شکل میں تکلیفوں اور غموں سے سابقہ

ضرور پیش آتا ہے۔اگر وہ بے صبری کا مظاہرہ کرے،ہر وقت جا بے جا اپنے غموں کا دُکھڑا روتا رہے ، اور اپنی تقدیر کا گلہ شکوہ کرے تب بھی اسے غموں سے بالکلیہ نجات نہیں مل سکتی ۔ لیکن اس صورت میں ایک تو وہ ہمیشہ ہمیشہ تکلیف کی گھٹن کا شکار رہے گا۔دوسرے اس بے صبری کا بہت بڑا نقصان یہ ہوگا کہ یہ تکلیفیں جو اس کے لیے اجر وثواب کا ذریعہ بن سکتی تھیں ان کا کوئی اجر بھی نہیں ملے گا۔

اس کے برعکس ایک انسان وہ ہے جو تکلیف اور صدمے کے موقع پر یہ سوچتا ہے کہ یہ چند روزہ دنیا کی تکلیف ہے،اور دنیا کی تکلیفوں سے کسی کو بھی مکمل چھٹکارا نہیں مل سکتا،اور اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا، خواہ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے ۔لہٰذا مجھے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا شکوہ کرنے کے بجائے اس کی حقانیت پر ایمان رکھنا چاہیے۔اگر چہ اس تکلیف دہ واقعے سے مجھے صدمہ پہنچا ہے،اس صدمے کی وجہ سے میرا دل بھی اُمڈ رہا ہے،لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ وہی جانتے ہیں کہ میری بہتری کس چیز میں ہے؟میں ان کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے اسے میرے حق میں بہتر بنادیں ۔میرے دل کو سکون اور تسلی عطا فرمادیں اور آئندہ مجھے ایسی تکلیفوں سے محفوظ رکھیں جو مجھے بے تاب کرنے والی ہوں ۔

اس شخص کی اسی سوچ کا نام صبر ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو تسلی ہوتی ہے، بے چینی میں کمی آتی ہے،دل کو قرار نصیب ہوتا ہے اور دوسری طرف جو تکلیف پہنچی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حساب اجر ملتا ہے۔قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ترجمہ: بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا ثواب بے حساب دیا جائے گا۔

یاد رکھیے !اس تکلیف کے موقع پر دل میں صدمہ پیدا ہونا کوئی گناہ نہیں ، بلکہ

تکلیف اور صدمے کے موقع پر بے اختیار جو رونا آجائے وہ بھی بے صبری میں داخل نہیں، بے صبری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض اور شکوہ شکایت شروع کر دے، اگر دل میں صدمے کی آگ سلگ رہی ہے، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، طبیعت پریشان ہے، بار بار رونا آرہا ہے، لیکن انسان اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حکمتوں پر ایمان رکھتا ہے، تو اسی کا نام صبر ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حساب اجر کا وعدہ ہے۔

اس صبر کی علامت یہ ہے کہ جب بھی دل میں صدمہ پیدا ہو انسان زبان سے کہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

جو لوگ صدمے کے موقع پر یہ کلمہ زبان سے کہتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ترجمہ: ایسے ہی لوگوں پر ان کے پروردگار کی طرف سے رحمتیں ہی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ایسے ہی لوگ ہدایت پر ہیں۔

لہٰذا بزرگانِ دین نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ صبر ہزار عبادتوں کی ایک عبادت ہے، جس سے انسان روحانی اعتبار سے ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

اور اس صبر کی عبادت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی بڑا صدمہ یا بڑی تکلیف پیش آئے تبھی انسان صبر کرے اور اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ کہے، بلکہ روزمرہ کی زندگی میں جو چھوٹی چھوٹی باتیں طبیعت کے خلاف پیش آتی رہتی ہیں ان پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: یعنی جب تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچے تو اسے چاہیے کہ وہ یہ کہے: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ یا اللہ! میں اس تکلیف پر ثواب کا طلب گار ہوں، مجھے اس پر اجر عطا فرمائیے اور اس

کی جگہ مجھے کوئی اس سے بہتر چیز عطا فرمائیے۔

نیز حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ کے سامنے چراغ گل ہو گیا تو آپ نے اس پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھنا چاہیے اور اس طرح روزمرہ پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے ناگوار واقعات پر ہر مرتبہ صبر کی عبادت کا ثواب ملتا رہتا ہے چلتے چلتے پاؤں میں کانٹا لگ گیا، دامن کسی چیز سے الجھ گیا، پاؤں پھسل گیا، گھر میں بجلی چلی گئی، کسی ناگوار واقعے کی خبر کان میں پڑ گئی، کوئی چیز گم ہو گئی، غرض اس جیسے ہر موقع پر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے رہنا چاہیے، اور ایک مرتبہ دل میں اس بات کا اعتقاد جما لینا چاہیے کہ ہر ناگوار واقعے کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت ہے ،بس اسی کا نام صبر ہے اور اس پر مسلسل بے حساب اجر ملتا رہتا ہے۔

ایک اور بات یہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جس طرح کسی صدمے کے موقع پر بے اختیار رو دینا صبر کے خلاف نہیں ہے، اسی طرح کسی تکلیف کے موقع پر اس تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرنا بھی صبر کے خلاف نہیں۔ مثلاً بیماری آئی تو اس کا علاج کرنا صبر کے خلاف نہیں، بے روزگاری ہوئی تو روزگار کی تلاش صبر کے منافی نہیں۔ بلکہ یہ تمام کوششیں بھی کرتے رہنا چاہیے اور تکلیف دور ہونے کی دعا بھی، بلکہ تکلیف کی شدت میں کراہنا بھی صبر کے خلاف نہیں، کیوں کہ صبر کی حقیقت صرف وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر کوئی اعتراض اور شکوہ نہ ہو، اور وہ زبان سے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتا رہے۔

کہنے کو یہ ایک مختصر عمل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر جو اجر و ثواب لکھا جاتا ہے اس کا تصور بھی اس وقت ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

انسان کی ماورائی شخصیت، روح، نفس اور زندگی

(ایٹمی سائنسدان سلطان بشیر محمود)

تعارف:

انسان کی ماورائی حیثیت کے متعلق جدید سائنسی تحقیقات واضح اشارہ کرتی ہیں کہ انسانی روح کوئی مفروضہ نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ہمارے اپنے ماحول میں بھی ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں اگر ہم اِن پر غور کریں تو روحوں کا وجود ہمارے لئے کوئی معمانہ رہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ان کا مشاہدہ کئے بغیر پاس سے گزر جاتے ہیں۔ اگر مشاہدہ کرتے بھی ہیں تو غور نہیں کرتے، یا پھر ہم اپنے مشاہدے کو ذاتی حد تک محدود کر لیتے ہیں۔ ساری دنیا میں لوگوں کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔ ڈاکٹر ریمنڈ موڈی جنہوں نے امریکہ میں عارضی موت کے بعد زندہ ہونے والوں پر تحقیق کی ان کا بھی یہی کہنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلی صدی میں مادیات کا حملہ اس قدر شدید رہا ہے کہ روحوں جیسی غیر مادی مخلوق کی بات کرنے یا سننے کے لئے بڑا حوصلہ چاہیے۔ اکثر ذہن اس قدر مرغوب ہو چکے ہیں کہ ایسے حقائق کا سامنا کرنے کی تاب نہیں لاتے، چنانچہ آسان راستہ یہی رہ جاتا ہے کہ اس سلسلہ پر خاموشی اختیار کی جائے یا صرف کہہ دیا جائے ہمیں کچھ معلوم نہیں یا انکار کر دیا جائے۔

لیکن اس سوچ کو آپ روشن خیالی نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ انتہائی غیر سائنٹیفک، مقلدانہ سوچ ہے۔ جس کی رو میں بہہ کر انسان اپنے آپ سے بہت دور ہوتا جاتا ہے۔ کبھی وہ مذہب کے زیر اثر اپنی پہچان کو روحانی حوالہ سے جانتا تھا، لیکن اب مادیات کے دباؤ نے

انسان کی سوچ کو بھی مادی بنا دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان روحانی اطمینان کھو چکا ہے اور وہ مادی سائنس سے اس قدر متاثر ہے کہ ٹھوس دلیل کے بغیر کوئی بات ماننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ لہٰذا آج بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان کے ماورائی پہلوؤں کو سائنسی انداز میں سمجھا اور پرکھا جائے۔ یہ کام مادی سائنس سے بھی بڑا کام ہے لیکن افسوس کہ آج کا انسان باوجود غیر معمولی مادی ترقی کے اس لحاظ سے تاریک دور میں ہے۔ اگر کوئی اس موضوع پر سنجیدہ ریسرچ کرنا بھی چاہے تو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دراصل سائنس کی دنیا بھی مقلدین سے بھری پڑی ہے۔ اگر کسی بڑے سائنسدان نے کہہ دیا کہ مذہب میرا مسئلہ نہیں، روحیں میرا موضوع نہیں یا میں خدا کی ہستی کا قائل نہیں ہوں تو بہت سے دوسروں نے اس کی تقلید ہی کو اپنی تقدیر بنا لیا۔ حالانکہ سائنس کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ سیاسی و معاشرتی وجود سے قطع نظر کسی بڑے سائنسدان نے یہ نہیں کہا کہ اس کی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا وجود نہیں یا ارواح کوئی چیز نہیں۔ اگر کہا بھی ہو تو پھر کیا، حقیقت کسی کے کہنے سے بدل نہیں سکتی۔ درحقیقت سائنس میں اس قدر گہری جزئیات ہیں کہ اپنے دائرہ کار سے باہر بڑے سے بڑا سائنسدان اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی بڑا سائنسدان یہ کہہ دے کہ خدا نظر نہیں آتا تو وہ ہرگز قابلِ تقلید نہیں۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی غلط ہے کہ سائنسدان کی اکثریت خدا کو نہیں مانتی۔ سچ تو یہ ہے کہ کچھ بڑے سائنسدان ایسے بھی ہیں جن کا خدا کی ہستی پر ایمان مذہب کے مبلغین سے بھی زیادہ رہا ہے۔

روحوں پر سائنسی تحقیقات: دراصل ارواح کی سائنس آج کے دور میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو گلیلو (Galileo) کے زمانہ میں کائنات کی تھی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ آج دنیا میں کئی ایک ادارے اور سنجیدہ سائنسدان ہیں جو اس موضوع پر نہایت شد و مد سے تحقیق میں مشغول ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں پچھلے پچاس سالوں میں جو کام ہوا وہ یقیناً قابلِ قدر

ہے ۔اسکے علاوہ روس میں بھی ٹیلی پیتھی اور روحانی سراغ رسانی کے حوالے سے انسان کی ماورائی حیثیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے اور وہاں اس موضوع پر ایک سائنسی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے ۔اگر کوئی پیچھے رہنے والے ہیں تو وہ ہمارے مسلمان ممالک ہیں ۔اس لئے پاکستان میں بھی ضروری ہے کہ روحوں پر تحقیق کا کام شروع کیا جائے ، بلکہ ہمارے اوپر اسلام کی طرف سے بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم دنیا کو اپنے دین کی تعلیمات کی روشنی میں ارواح ,فرشتوں اور جنات جیسی فوق الطبیعیات مخلوقات سے روشناس کرائیں تاکہ آدمی اپنے آپ کو بہتر سمجھ سکے ۔ ورنہ بعید نہیں کہ مغرب کی مادیات، روحوں کے متعلق علوم کو بھی اپنے مادی رنگ میں رنگ دے ۔

روحوں کے بارے میں سائنسی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوتی نظر آتی ہے کہ روح انسان کا وہ حصہ ہے جس کا جسمانی موت کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔اگر چہ ابھی تک ہونے والے سائنسی تجربات اور مشاہدات موت کے بعد بہت مختصر وقفہ کا احاطہ کرتے ہیں ، زیادہ سے زیادہ دس سے پندرہ منٹ ،لیکن ان سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچی ہے کہ انسانی شخصیت زندہ رہتی ہے اور دنیاوی زندگی کے ساتھ ہی ایک اور زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے ۔ سائنسی تجربات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عارضی طور پر مرنے والے لوگوں نے دوسری دنیا میں جو کچھ دیکھا یا سنا وہ ان کی دبی ہوئی خواہشات اور رجحانات کے زیر اثر نہیں تھا بلکہ واقعی جسم سے باہر کے مشاہدات تھے ۔یعنی یہ سب تحقیق ثابت کرتی ہے کہ موت انسان کی بقا میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے ۔یہ وہی بات ہے جو قرآن کریم ہمیں بار بار سمجھانے کی کوشش کرتا ہے ۔

فرمایا: ۔ترجمہ: ” آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما دیں کہ دیکھو وہ موت جس کا تم سامنا کرنے سے ڈرتے ہو، یقیناً تم اس سے مل کر رہو گے ۔اس کے بعد تم اسکے سامنے حاضر کر دیئے جاؤ گے جو حاضر اور غائب تمام ترعلم رکھتا ہے اس وقت وہ تمہیں بتائے گا کہ تم دنیا میں کیا کرتے رہے ہو ۔“ (سورۃ الجمعہ، آیت ۔8)

قرآنی تعلیمات ہی کی روشنی میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جیسے فرشتوں کی تخلیق کی بنیاد غیر مادی توانائی ہے اسی طرح روح بھی ایک نور ہے، لیکن یہ نوری توانائی کس قسم کی ہے اس کا علم ابھی تک انسانی علم کے دائرے سے باہر ہے ۔ آج کل '' الغیب '' (Hidden Matter and Energy) پر جو تحقیقات ہو رہی ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ ان سے یہ عقدہ بھی حل ہو جائے ۔ جیسے قرآن کریم میں جوڑوں (Pairs) میں پیدائش کا تخلیقی فارمولا دیا گیا ہے سائنس بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ہر چیز کا جوڑا ہے ۔ اس اصول پر طبیعیات اور مابعد طبیعیات کا بھی جوڑا ہونا چاہیے ۔ یعنی یہ کوئی غیر سائنسی بات نہیں کہ کائنات میں غیوب موجود ہیں جو ہمارے مشاہدے میں آنے والی کائنات کے متوازی مخلوقات ہیں ۔ روح، فرشتے، حیات، جنت، دوزخ ایسے تمام ماورائی حقائق اسی کا حصہ ہیں ۔

حضرت آدمؑ کی پیدائش سے پہلے اور ان کی پیدائش کے بعد مکالمہ فرشتوں، شیطان اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے درمیان کلام پاک میں دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوں کی تخلیق کا منبع نار ہے جو طبیعیات میں آگ کا مظہر ہے جب کہ فرشتوں کی تخلیق نور سے وجود میں آئی جس کا ایک مظہر روشنی ہے ۔ یوں جنات اور فرشتوں کی فطرت میں اگر چہ زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اپنی ماہیت میں ایک ہی ہیں ۔ دونوں کی خاصیت برقی مقناطیسی شعائیں (Electromagnetic Radiations) ہوسکتی ہیں جن میں فرق صرف فریکوئنسی (Frequency) کا ہے ۔ اسی طرح عین ممکن ہے کہ انسان کی روح بھی کسی طرح کی برقی مقناطیسی شعاؤں ہی کی توانائی ہو ۔ بہر حال حتمی طور پر ابھی تک انسان اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ۔ اگر چہ امریکہ اور مغربی ممالک میں نفوس کی جو تصاویر لی گئی ہیں ان میں یہ ایک نوری ہیولا کی مانند ہی نظر آتا ہے ۔

جہاں تک آدمی کی زندگی کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سب توانائی سے

چلنے والی مشینوں کی طرح ہیں جن کے اندر اپنے ہی پاور ہاؤس ہیں مثلاً ہماری زندگی کی ہر حرکت، ہر سانس، ہر سوچ، ہر نظر، درحقیقت توانائی ہی کی مختلف اشکال ہیں جسکا منبع دراصل سورج ہے، لیکن چونکہ ان عوامل کا اظہار جسمانی اعضاء کے ذریعہ ہوتا ہے اس لئے ہم انہیں ہی سب کچھ مان لیتے ہیں۔

انسان کی شخصیت میں توانائی کے عمل کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے پڑھنے کے عمل کی مثال مفید رہے گی۔ آپ جو مضمون پڑھ رہے ہیں اس کی سائنسی توضیح یوں ہے کہ کاغذ کے صفحہ پر گرنے والی روشنی کی توانائی کاغذ اور حروف سے ٹکرا کر آپ کی آنکھ پر مرتکز ہورہی ہے۔ یہاں توانائی کی یہ کرن بجلی کی لہروں میں بدل جاتی ہے، پھر بجلی کی شکل میں یہ توانائی دماغ کے ان حصوں میں پہنچ جاتی ہے جو دیکھنے کے لئے مخصوص ہیں، وہاں دماغ کے خلیات پر اثر انداز ہوکر کیمیائی توانائی کی ایک اور شکل کو جنم دیتی ہے جو حروف کو دماغ کے حافظہ کے خلیات پر نشانات کی شکل میں محفوظ کر دیتی ہے اور وہاں عقل اس کو معانی کا جامع پہناتی ہے۔ اس سارے عمل میں آپ نے دیکھا ہے کہ مادی آنکھیں اور دماغی خلیات وغیرہ محض ذرائع ہیں جو توانائی کی ایک حالت کو دوسری حالت میں تبدیل کرنے کے کام آتے ہیں اور نہ دیکھنے، پڑھنے ،سمجھنے اور یاد رکھنے کا عمل اپنی فطرت میں توانائی ہے۔ اس کے بعد ان سے معانی اخذ کرنا اور ان سے اثر لینا اور پھر ان پر عمل کرنا کسی اور غیر مرئی وجود کا محتاج ہے۔ جس کو ہم شعور، عقل وغیرہ کا نام دیتے ہیں جو اپنی حقیقت میں نہ توانائی ہیں نہ مادہ بلکہ ہمارے نفس ہی کے خواص ہیں۔

اس لطیف مثال سے قطع نظر آپ انسانی نشو ونما ہی کو لیں۔ ظاہر میں یہ 100 فیصد مادی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً ہمارا گوشت پوست، چربی، ہڈیاں یعنی ہمارے جسم کے مادی اجزا بھی اپنی اصل میں سورج کی توانائی سے ہی بنے ہیں۔ اس عمل میں پودے سورج سے توانائی لیکر خوراک بناتے ہیں جو ہم کھاتے ہیں۔ اسی طرح

بالواسطہ جسم سورج ہی کی توانائی کی ایک مادی شکل ہے اور چونکہ سورج کا وجود بگ بینگ کے امرکن کی وجہ سے ہے اس لئے حقیقت کے باطنی پیمانوں پر ہم سب بگ بینگ میں بھی موجود تھے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہر انسان کا آغاز ایک ایسے جرثومہ سے ہوتا ہے جس کا سائز ایک سینٹی میٹر کے کھربویں حصہ کے قریب ہے یہ وہ چیز ہے جسے دیکھنے کے لئے بہت ہی زیادہ طاقتور خوردبین چاہیے لیکن جدید سائنس کا کہنا ہے کہ ہماری تمام شخصیت اس کے اندر موجود ہوتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے کسی درخت کی شخصیت اس کے بیج کے اندر پنہاں ہوتی ہے۔سورج کی توانائی سے پیداشدہ خوراک کھا کر ہم ایک نہ نظر آنے والے جرثومہ سے بڑھ کر وہ آدمی بن جاتے ہیں جو کائنات پر غور وفکر اور اسے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات اتنا ناشکرا ہے کہ اپنے ہی رب کے وجود پر شک کرتا ہے۔

ان مثالوں کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ہمارے مادی جسم اور زندگی کی حقیقت کسی لطیف توانائی کا ہی نتیجہ ہیں اور روح وہ امرِ ربی ہے جس کے حکم اور پروگرام کے ماتحت ہمارا وجود شروع ہوتا ہے اور یہی زندگی کی بھٹی سے گزر کے نفس بن کر نکلتی ہے۔

قرآنی تعلیمات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ روحیں اس وقت بھی موجود تھیں جب انسانی جسم کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی۔پھر تمام انسانیت کی روحیں حضرت آدمؑ کے جسم میں داخل کر دی گئیں۔یہ جنت کے زمانہ کی بات ہے۔روحوں کا عمل تولید کے ذریعہ انسانی اجسام میں داخل ہونے کا عمل حضرت آدمؑ کے دنیا میں ظہور کے ساتھ ہوا۔حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ماں کے پیٹ میں بچے کے آغاز کو جب چالیس دن ہو جاتے ہیں تو اس میں روح داخل ہوتی ہے۔پیدائش کے بعد حالات اعتقادات اور اعمال کے اثرات کے نتیجہ میں یہی فطری روح،نفس کی شکل اختیار کر لیتی ہے جیسے بیج سے پودا اگتا ہے۔ہمارا مستقبل ہمارے نفس کی اس حالت پر منحصر ہے جس حالت میں اس دنیا کو ہم چھوڑتے ہیں۔

حضرت آدمؑ کے وجود میں ہم سب کی روحیں تھیں آیت مبارکہ (38)2 ''تم سب اتر جاؤ'' سے ظاہر ہے اس حکم میں تمام نوع انسانی شامل ہے۔فرمایا:۔

ترجمہ: ''ہم نے حکم دیا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے،تو جو میری ہدایت کی اتباع کرے گا۔نہ ہوگا ان کے لئے کوئی خوف اور نہ کوئی غم''۔(سورۃ البقرہ،آیت۔38)

زمین پر بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے متعلق بھی وعدہ لیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:۔ترجمہ:''(اے نوع انسانی)اللہ تبارک وتعالیٰ کی اپنے اوپر مہربانیاں یاد کرو اور اس وعدہ پر غور کرو جس پر تم نے پابند رہنے کا عہد کیا۔اس وقت تم سب نے یہ کہا تھا کہ ہم نے اس وعدہ کو اچھی طرح سن لیا ہے اور اطاعت کی۔اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو(اب تم اس وعدہ کے مطابق اپنے رب کے فرائض کو پورا کرو)بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے اندرونی راز بھی خوب اچھی طرح جانتا ہے''۔(سورۃ المائدہ،آیت۔7)

اگر ہم انسانی ضمیر کا مجموعی طور پر تجزیہ کریں تو ان آیات میں چھپی ہوئی یہ گہرائی نظر آنے لگتی ہے۔ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ انسانی جین میں لکھ دیا اور ہم سب اس کی یادداشت (Memory) کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ انسان خواہ کہیں کا ہو،کسی بھی زمانہ کا ہو۔اس میں رب تعالیٰ کی ذات کا احساس ضرور ہوتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ بسا اوقات ماحول کے زیرِ اثر وہ اس کا پورا ادراک کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔اپنی زمینی حیات میں روح جب نفس بن کر ابھرتی ہے اس کے بارے ارشاد ہے کہ:۔

ترجمہ: ''قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے سنوارا،اس کو صحیح اور غلط کی تمیز عطا کی،بے شک اس نے فلاح پائی جس نے (اس کو نیک کاموں سے) سنوارا۔اور یقیناً نا کام ہوگیا جس نے اسے خراب کیا''۔(سورۃ الشمس،آیات۔7-10)

انسان خواہ ان پڑھ ہو عالم ہو، جاہل ہو، مشرق کا ہو، نیا ہو یا پرانا ، جدید دور کا ہو یا آج سے ہزاروں سال پہلے کا ،ان سب کا بغور تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان سب میں صحیح اور غلط کی تمیز اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاقی قدریں تقریباً سب معاشروں میں مشترک ہیں، فریب اور جھوٹ کو ہمیشہ برا کہا گیا ہے، ظلم کو ہمیشہ ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور کسی نہ کسی شکل میں سبھی اللہ تعالیٰ پر یقین کرتے آرہے ہیں ۔اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف قرآن کریم کی آیات (10-7)9 اور (7)5 میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی غلط اور صحیح کی تمیز اور باری تعالیٰ کا تصور انسانی روح میں شروع ہی سے رکھا ہوا ہے لیکن تعلیم و تربیت ، ماحول اور شعور کے اختیار کے استعمال سے نفوس کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں۔

آزمائش اور اس کی ضرورت: اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ آزمائش کیا ہے۔ ہر تخلیقی کارکن خواہ وہ انجینئر ہو، سائنسدان ہو، ڈاکٹر ہو یا آرٹسٹ ہو جب کسی نئی تخلیق کا خاکہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کا مقصد متعین کرتا ہے، پھر ڈیزائن شروع کرتا ہے جس میں اس کی قابلیت ،اہلیت اور کارکردگی ڈال دی جاتی ہے۔ جب ڈیزائن اچھی طرح مکمل ہو جاتا ہے تو پھر کاریگر اس مشین کا ماڈل بناتا ہے ۔ پھر ڈیزائن کی طلب (Requirement) کے مطابق اسے امتحان کے مختلف مرحلوں سے گزارا جاتا ہے ۔ جب ماڈل تمام آزمائشوں سے گزر چکا ہوتا ہے تو مطلوبہ تعداد میں فیکٹری کو تیاری کا آرڈر مل جاتا ہے۔وہاں بھی ہر ایک پروڈکٹ کو ٹیسٹنگ کے پروگرام میں سے گزرنا پڑتا ہے ۔اگر کوئی پروڈکٹ قابل اصلاح نہیں ہوتی تو اس کو دوبارہ پگھلانے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

یہی مثال ہم پر صادق آتی ہے ۔ جنت میں حضرت آدمؑ کی مثال ایک ماڈل کی تخلیق جیسی ہے اور دنیا میں تولیدی سلسلہ کی مثال فیکٹری میں مصنوعات کی عام پیداوار (Mass Production) کی سی ہے ۔آدمؑ کو جنت میں ٹیسٹ سے گزارا گیا ۔

ہمارے لئے آزمائش کی تجربہ گاہ اس دنیا کو قرار دیا گیا۔آزمائش کے لئے مطلوبہ لوازمات کا کام انسانی تقدیر سے لیا جاتا ہے۔نتیجہ اس پر ہمارے ردعمل سے ظاہر ہوتا ہے۔تقدیر اور اعمال سے دیکھنا یہ ہے کہ کیا روح مطلوبہ آزمائشوں پر پورا اترتی ہے یا نہیں؟ جو نفوس آزمائشوں پر پورا اترتے ہیں انہیں معیار کے مطابق درجات مل جاتے ہیں۔اگر کوئی خامی یا نقص رہ جائے تو ٹھکائی (Rework) کے مقام پر بھیج دیا جاتا ہے جسے جہنم کہا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ گنہگار نفوس بھی مطلوبہ معیار پر پہنچنے کے بعد اپنے اصلی گھر یعنی جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔لیکن کچھ نفوس ایسے بھی ہیں جو ٹھکائی (Rework) کے قابل نہیں رہتے ان کو ہمیشہ کے لئے ڈھلائی کے جہنم میں ڈال دیا جاتا ہے ۔آزمائش کی اس پوری روئداد کو قرآن کریم چند الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ:۔

ترجمہ:''بے شک ہم نے انسان کو (دنیا میں) ایک نطفہ سے پیدا کیا۔اس لئے کہ ہم اسے آزمائیں اسے سننے اور سمجھنے والا بنا دیا''۔(سورۃ الدھر، آیت۔2)

نفوس کے دنیا پر آزمائشی دور میں سے گزارنے کا فیصلہ اس وقت صادر ہوا جب جنت میں حضرت آدمؑ اور حضرت حوا علیہا السلام کی ارواح کو حق خود اختیاری اور شعور عطا کر دیا گیا لیکن انھوں نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ وہ اپنی اس صلاحیت کو ٹھیک طرح استعمال نہیں کر رہے ہیں۔جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس کی کہانی اس طرح بتائی ہے کہ جب آدمؑ اور حوا علیہا السلام کی تخلیق ہوئی اور انہیں شعور کے ساتھ ساتھ حق خود اختیاری بھی دے دیا گیا تو ان سے کہا گیا کہ یہ جنت ہے اس میں جہاں چاہو تم رہو اور جو چاہو کھاؤ پیو۔لیکن انہیں متنبہ کیا گیا کہ یہ شجر ہے جس کے قریب بھی تم نے نہیں جانا، یعنی آزمائش کا مطلوبہ معیار پوری طرح واضح کر دیا گیا۔یوں آدمیت درحقیقت روح کے شعوری طور پرحقِ خود اختیاری کا نام تھا۔وہیں ان کا ایک حاسد دشمن بھی ان کے ساتھ تھا جو چاہتا کہ کسی

طرح آدمی اپنے خالق کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو جائے۔ اس نے دوست بن کر آدمؑ کو ورغلایا جس کے نتیجہ میں وہ ڈسپلن کی اس آزمائش پر پورا نہ اتر سکے جو ان کے جنت میں ہمیشہ رہنے کی لازمی شرط تھی۔ اس پر انہیں زمین کی طرف بھیج دیا اور فیصلہ فرمایا کہ جنت کو دوبارہ پانے کے لئے بنی آدمؑ میں سے ایک ایک کو آزمائش کے امتحانوں میں سے گزارا جائے گا اور صرف اسے ہی اپنے حقیقی مقام یعنی جنت پر فائز کیا جائے گا جو مطلوبہ معیار پر پورے اتریں گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا: ترجمہ: ''اتر جاؤ تم سب کے سب، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اب زمین پر کچھ عرصہ تمہارا قیام ہوگا اور وہیں پر تمہارے استعمال کی چیزوں کا انتظام ہوگا اور فرمایا! اسی میں تم رہو گے اور اسی میں مرو گے اور پھر اسی میں سے تم نکالے جاؤ گے''۔
(سورۃ الاعراف، آیت۔24-25)

روح اور زندگی کا امتیاز: اس بات کو واضح کرنے کے بعد روح اور نفس کیا ہے، اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ زندگی کیا ہے؟ کیا یہ روح کی وجہ سے ہے یا روح اس کی وجہ سے ہے؟ اور کیا حیوانات میں بھی روح ہے؟

ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ قرآنی تعلیمات سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی قوانین ربی کی امین ہے اور ایٹم، ایٹم میں موجود ہے جو ان کی اپنی زندگی ہے۔ لیکن روح جو علم، شعور اور اختیار رکھتی ہے وہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔ جہاں تک ''جان'' (Life) کا تعلق ہے یہ انسانوں اور حیوانوں سب میں مشترک قدر ہے۔ جان کا مقصد روح کو ایک متحرک جسمانی شخصیت دینا ہے جس کے ذریعہ وہ دنیا کے اسباب سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوتی ہے جب کہ خود اختیاری کی بناء پر اپنے لئے زندگی کا ایک راستہ متعین کرتی ہے۔ کوئی سرکشی کر کے اپنے رب سے دور نکل جاتا ہے اور کوئی فرمانبرداری کر کے قریب تر ہو جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ترجمہ: ''(اے نوعِ انسانی) تمہیں آخر کس چیز نے اپنے

پروردگار سے سرکشی کرنے پر مجبور کردیا ہے؟ جس نے تم کو پیدا کیا' پھر سنوارا، اور پھر ایک نسبت سے بڑا کیا، وہ جس شکل میں چاہتا ہے تمھیں بنادیتا ہے"۔ (سورۃ الانفطار، آیات ۔ 6-8)

اوپر کی آیت میں انسان کی (Biochemical) نشوونما اور جرثومہ سے لیکر بچہ کی پیدائش تک کے تین مرحلوں کا ذکر کیا گیا ہے سب سے پہلے پیدا کیا یعنی زندگی دی، پھر اس زندہ جرثومہ کو بڑا کرنا شروع کر دیا اور اعضا بنائے ، یہ نہیں کہ ناک تو بڑی ہو جائے لیکن آنکھ چھوٹی رہ جائے ، دایاں ہاتھ تو بڑا ہو جائے اور بایاں چھوٹا رہ جائے بلکہ ہر عضو کو ایک متناسب حسن سے بڑا کیا۔

جہاں تک روح کا تعلق ہے مندرجہ ذیل آیات کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جب انسان کا بچہ رحمِ مادر میں انسانی شکل پالیتا ہے تو پھر اس میں اللہ تعالیٰ اپنا امر پھونک دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ انسان خصوصیت پر سرفراز ہوجاتا ہے۔ فرمایا:۔

ترجمہ: "وہ جس نے ہر چیز کو احسن طریقہ سے پیدا کیا اور آغاز کیا انسان کی پیدائش کا مٹی سے ۔پھر اس نے ان کی نسل بنائی ایک بے قدر پانی کے خلاصہ سے، اور پھر اسے سنوارا، اور پھر اس میں اپنی روح سے کچھ ڈال دیا ۔اور تمھارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے مگر تم بہت تھوڑا شکر ادا کرتے ہو"۔ (سورۃ السجدہ، آیت ۔ 7-9)

روح اور جان کی نشوونما: اوپر دی گئی وضاحت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی جرثومہ (Ovam) میں جان ابتدا ہی سے ہوتی ہے اور روح بعد میں داخل ہوتی ہے ۔ پھر دونوں بڑھنا پھولنا شروع کر دیتے ہیں ۔ یوں وہ جرثومہ جلد ہی ایک ایسی شکل میں آجاتا ہے جس سے انسانی جسم کا آغاز ہو جاتا ہے ۔اس کے بعد انسانی جسم کی نشوونما جاری رہتی ہے حتیٰ کہ وہ ایک مکمل انسان کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوجاتا ہے ۔

روح اور جان کے امتزاج کے متعلق آج سے ایک ہزار سال پہلے امام غزالیؒ نے

اپنی کتاب'' کیمیائے سعادت'' میں سیر حاصل بحث کی ہے۔زندگی کے جس جز کو ہم نے حیات (Biochemical Life) کہا ہے امام غزالی نے اس کا نام روحِ حیوانی رکھا۔ جس کے وجود کوانہوں نے عناصر کی ایک خاص ترتیب کا مرہونِ منت قرار دیا ہے۔جس جز کو ہم نے نفس کہا ہے وہ اس کو روحِ انسانی کہتے ہیں۔شاعر برج نرائن چکبست لکھنوی نے اپنے خیالات کی اس طرح ترجمانی کی۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے،انہی اجزا کا پریشان ہونا

آیات کریمہ (9-5)32 کے حوالہ سے امام غزالی ؒ فرماتے ہیں: یہاں دونوں روحوں کے الگ الگ ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ایک روح کا مٹی کے تعلق سے ہے اور اسکے معتدل کرنے کے عمل کی طرف **سویته** کا اشارہ کیا یعنی میں نے اس کو سنوارا اور یہی اس کا اعتدال تھا اس کے بعد فرمایا گیا۔''اس طرح اللہ تعالٰی نے انسانی روح کو اپنے آپ سے نسبت دے کر انسان میں اپنی صفاتِ اعلٰی کی صلاحیت عطا کر دی۔امام غزالی کہتے ہیں کہ چونکہ روح حیوانی کا سفلی اشیاء سے تعلق ہے اس لئے علم طب میں اس کی وضاحت موجود ہے اور اس کے مزاج کو اعتدال پر رکھنے کے لئے علاج مقرر ہیں تاکہ بیماریوں سے نجات مل سکے۔اس کے برعکس روحِ انسانی علوی ہے جو قلب کی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے اس کے لئے بھی اعتدال کے درجات بنا دیئے گئے ہیں اور روح انسانی کو معتدل رکھنے کے لئے شریعت اسلام نے علم،اخلاق اور ریاضت کو بنایا ہے (صفحہ 113 ترجمہ کیمیائے سعادت۔ مترجم ناصر نقوی)

ہوسکتا ہے کہ روح اور جان کے اس نظریہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ روح اگر علم' اچھے برے کی تمیز اور حق خود اختیاری کا منبع ہے تو پھر سب لوگوں میں

یہ استعداد مختلف کیوں ہے؟ اس سوال کے جواب میں پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ روح کی مثال بیج کی سی ہے ۔ جدید سائنس کے استعاروں میں یہ جینز پر ثبت شدہ ہدایات (Instructions) کی مانند ہے جو باپ کے جرثومہ کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے ۔اس میں سیکھنے، سمجھنے اور جاننے کی بنیادی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں لیکن ان کی استعداد کو بڑھانا اور ان سے کام لینا انسان کا اپنا کام ہے ۔جس میں والدین ، سکول اور معاشرتی ماحول اور دیگر ماورائی اثرات وغیرہ سبھی شامل ہیں ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اس کی تکمیل کی اور اس میں اچھے برے کی تمیز کی فطرت ڈالی ۔وہ آدمی یقیناً کامیاب ہوا جس نے نفس (کی اس فطرت کو)تقویت دی اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس نے اسے برباد کیا''۔(سورۃالشمس،آیات 7-10)

اس لئے اپنی فطری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا اور ان کو بڑھانا انسان کا فرض ہے ۔اگر دیکھا جائے تو دنیا میں آنے کا مقصد یہی ہے کہ ہمارا نفس کامیابی سے ان تمام آزمائشوں سے گزرتا جائے تاکہ پاس ہو کر اپنے حقیقی مقام کو پا سکے ۔اس لئے جو لوگ اس آزمائشی دور میں اپنے نفس کی صحیح سمت میں نشو نما نہیں کرتے انہیں اس بات کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ مقرر شدہ معیار پر پورا اتر سکیں گے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ'' کہو! کیا ہم بتا دیں کہ سب سے بڑھ کر ناقص اعمال کن لوگوں کے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دوڑ دنیا کی زندگی کے لئے لگی ہوئی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں ۔یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں سے انکار کیا اور اپنے رب کی ملاقات سے منکر ہوئے ۔سو ان کے تمام اعمال ضائع ہو گئے پس ہم ان کے لئے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے۔''

(سورۃالکہف،آیات 104-105)

سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے

(پروفیسر احمد بن ولید العراقی)

نبی الانبیاء اور امت وسط کی سبقت:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا
جنت تمام انبیاء علیہم السلام پر حرام ہے جب تک میں (محمد رسول اللہ ﷺ) اس میں داخل نہ ہو جاؤں اور جنت تمام امتوں پر حرام ہے جب تک میری امت اس میں داخل نہ ہو جائے
یہ امت باقی امتوں سے پہلے قبور سے باہر آئے گی۔ موقف میں سب سے اعلیٰ مقام پر سب سے پہلے سرفراز ہوگی۔ سب سے پہلے صراط کو عبور کرے گی اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔ پس جنت سب انبیاء کرام علیہم السلام پر حرام ہے جب تک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اس میں داخل نہ ہوں اور سب امتوں پر حرام ہے جب تک حضور ﷺ کی امت اس میں داخل نہ ہو (حادی الارواح 153)

امت مصطفیٰ ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہم آخری امت ہیں لیکن روز قیامت ہم سب سے پہلے (قبروں سے) اٹھیں گے۔ اور ہم ہی سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔'' (حادی الارواح 153)

اس امت کا سب سے پہلے جنت میں جانے والا فرد:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے مجھے جنت کا

وہ دروازہ دکھایا جس سے میری امت داخل ہوگی۔حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا''یارسول اللہ! میں پسند کرتا ہوں کہ کاش میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا حتیٰ کہ میں بھی اس دروازہ کو دیکھ لیتا۔''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سن لو اے ابو بکر! میری امت میں سے سب سے پہلے آپ جنت میں جائیں گے۔

حضرت بلال کی جنت میں سبقت:

1- ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ''بلال جنت میں سب سے پہلے داخل ہوگا۔''
صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا: ''یارسول اللہ! آپ ﷺ سے بھی پہلے؟''
''ہاں مجھ سے بھی پہلے۔میں جس ناقہ پر سوار ہوں گا اسکی مہار بلال نے تھام رکھی ہوگی اس طرح بلال مجھ سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔''(دنیائے اسلام کا پہلا مؤذن، باب:بلال اور جنت)

2- سرور کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ طائف کے واقعہ کے بعد ہجرت مدینہ کے درمیانی مدت میں معراج کرائی۔معراج کی واپسی پر سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''جنت تو بلال کی مشتاق ہے''

پھر حضور ﷺ نے سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا: اے بلال! تم کونسا عمل کرتے ہو جس کی وجہ سے میں نے تمہیں جنت میں اپنے آگے دیکھا۔''

حضرت بلال نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں جب بھی وضو کرتا ہوں دو رکعت تحیۃ الوضو ضرور ادا کرتا ہوں۔''

سرکار کائنات ﷺ نے فرمایا: ''اے بلال! تو نے یہ سعادت اسی عمل کی وجہ سے پائی ہے۔''(صحیح البخاری، کتاب الجمعہ، حدیث نمبر 18081)(مسلم، کتاب فضائل صحابہ، فصل من

فضائل بلال ، حدیث نمبر 4497)(مسند احمد ، کتاب باقی المسند المکثرین ، حدیث نمبر 9295,8052) مشکوۃ شریف، کتاب، باب فصل صفحہ 108)

ویسے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول تھا کہ آپ اکثر رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے احتیاط چلا کرتے تھے، اسی لیے جنت میں بھی سرکار دو عالم ﷺ کی رحمت کے صدقے خادم رسول حضرت بلالؓ کو رفاقت کا شرف حاصل ہو گیا۔

3- حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا

میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے میں نے تیرے جوتوں کی آواز سنی۔''

4- حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے صبح کے وقت حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور فرمایا: اے بلال! تم مجھ سے جنت میں کیسے سبقت کر گئے؟ میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے سامنے سے تمہارے چلنے کی آواز سنی۔ میں گزشتہ رات بھی جنت میں گیا تو پھر اپنے سامنے سے تمہارے چلنے کی آواز سنی۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے جب بھی اذان دی ہے دو رکعت ادا کی ہیں اور جب بھی وضو ختم ہوا ہے اسی وقت وضو کیا ہے اور میں نے تہیا کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی دو رکعات میرے ذمہ ہیں۔'' حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یہ سبقت ان رکعات کی وجہ سے ہے۔'' (مسند احمد 360/354/5)

(ترمذی، فی المناقب 3689)

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کے آگے آگے بطور دربان اور خادم چلیں گے۔''

5 نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے بلال! میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے سامنے سے تمہارے چلنے کی آواز سنی۔ میں گزشتہ رات بھی جنت میں گیا تو پھر اپنے سامنے سے تمہارے چلنے کی آواز سنی پھر میں چوکور محل پر آیا جو سونے کا بنا ہوا تھا میں نے پوچھا یہ محل کس کا ہے؟ بتایا گیا۔

''یہ ایک عربی شخص کا ہے۔ میں نے کہا ''میں بھی تو عربی ہوں، یہ محل کس کا ہے؟ انہوں نے کہا'' یہ قریش کے آدمی کا ہے۔'' میں نے کہا'' میں بھی تو قریشی ہوں، یہ محل کس کا ہے؟'' انہوں نے کہا امت محمد کے ایک شخص کا ہے۔'' میں نے کہا میں محمد ہوں، یہ محل کس کا ہے؟ انہوں نے کہا یہ محل عمر بن الخطاب کا ہے۔''

(مسند احمد 360/354/5)(ترمذی، فی المناقب:3689)

مسلمان غرباء: حضرت سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص جناب رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

یا رسول اللہ ﷺ مجھے بتلائیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہم نشین کون ہوں گے؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ سے ڈرنے والے اور عاجزی و انکساری کرنے والے جو اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

اس نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہی لوگ جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔''

اس نے عرض کیا: پھر سب سے پہلے کون جنت میں داخل ہوگا؟''

ارشاد فرمایا: لوگوں میں سے سب سے پہلے غریب مسلمان جنت میں داخل ہوں گے جنت سے ان کے پاس کچھ فرشتے آئیں گے اور کہیں گے تم حساب کتاب کی طرف چلو

وہ کہیں گے ہم کس چیز کا حساب دیں؟ اللہ کی قسم !دنیا و دولت سے ہمیں کچھ بھی نصیب نہیں ہوا جس میں ہم بخل کرتے یا فضول خرچیاں کرتے اور نہ ہی ہم حکمران تھے کہ انصاف کرتے اور ظلم کرتے ہمارے پاس تو اللہ تعالیٰ کا دین آیا تھا، ہم اس کی عبادت میں مصروف رہے یہاں تک کہ موت آ گئی ان سے کہا جائے گا: تم جنت میں داخل ہو جاؤ نیک عمل کرنے والوں کے لئے بہترین اجر ہے۔''

داخلہ کے لئے سب سے پہلے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

سب سے پہلے جن کو جنت کی طرف بلایا جائے گا وہ ''حمادون'' ہوں گے جو (دنیا میں) خوشی اور تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بجالاتے تھے۔''

نصف دن کی سبقت:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''غریب مسلمان دولت مندوں سے آدھا دن جنت میں پہلے جائیں گے۔''

عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ آدھا دن کتنا ہے۔'' ارشاد فرمایا: پانچ سو سال

عرض کیا گیا: سال کے کتنے مہینے ہیں ارشاد فرمایا: پانچ سو مہینے

عرض کیا گیا: اس مہینے کے کتنے دن ہیں؟۔ ارشاد فرمایا گیا پانچ سو دن

عرض کیا گیا پھر ایک دن کتنا طویل ہے؟'' ارشاد فرمایا گیا: پانچ سو دنوں کے برابر جن کو تم شمار کرتے ہو۔'' (تذکرۃ احوال الموتی وامور الآخرۃ صفحہ نمبر 470)

چالیس سال سبقت: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فقراء مہاجرین قیامت کے دن (جنت میں) دولت مندوں سے

چالیس سال پہلے داخل ہونگے۔

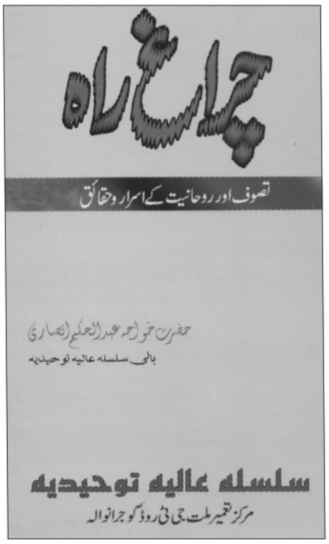
فقراء کا جنت میں پانچ سو سال پہلے داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو نہایت ہی زیادہ فقیر ہوں گے وہ امراء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے اس حدیث میں جو چالیس سال پہلے داخل ہونے کا ذکر ہے تو یہاں فقراء سے مراد وہ فقراء ہیں جن کے پاس کچھ مال و دولت تھا ایسے فقراء دولت مندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے۔

پیچھے رہ جانے والے کی حالت:۔

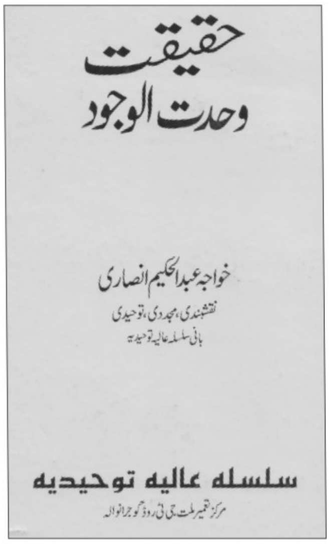
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

دو قسم کے مومن جنت کے دروازہ پر ملیں گے ایک مومن دنیا میں فقیر ہوگا دوسرا دولت مند۔ چنانچہ فقیر کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور دولت مند کو جب تک اللہ تعالیٰ روکنا چاہے گا روکا جائے گا پھر اس کو بھی جنت میں داخل کیا جائے گا جب فقیر کی اس سے ملاقات ہوگی تو وہ پوچھے گا اے بھائی! تمہیں کس چیز نے روک لیا تھا؟ اللہ کی قسم جب تو روکا گیا تو میں تیرے متعلق خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ بتائے گا اے بھائی! میں تیرے بعد دکھ، درد اور گھبراہٹ کے ساتھ (جنت کے باہر) روک لیا گیا تھا۔ میں تم تک نہیں پہنچ سکا تھا اور میرا پسینہ اتنا بہا کہ اگر اس پر ایک ہزار نمکین اور تلخ کھانے والے اونٹ جمع ہو جائیں تو اس سے سیر ہو کر واپس جائیں۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات ،مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔زوال اُمت میں اُمراء ،علماء،صوفیاء کا کردار۔علماء اورصوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوّف کے انسانی زندگی پراثرات۔سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔مصنّفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدات کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کردیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقاء اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت ،بنیادی سوال جس نے نظریۂ وحدت الوجود کو جنم دیا اورروحانی سلوک کے دوران بزرگان عظّام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔

سلسلہ توحیدیہ کی مطبوعات

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات، اسلامی تصوّف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار، ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اوران کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرارورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمّل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد، اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبّت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔



Reg: CPL - 01

Website www.tauheediyah.com